سوشلزم

50 سوال اوران کے جوابات

سوالات

1- کمیونزم کیا ہے؟

2- پرولتاریہ کیا ہے؟

3- کیا پرولتاریہ کا وجود ہمیشہ سے تھا؟

4- پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟

5- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ پرولتاریہ اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے؟

6- صنعتی انقلاب سے پہلے محنت کش طبقے کی کیا شکل تھی؟

7- پرولتاریہ غلاموں سے کن بنیادوں پر مختلف ہے؟

8- پرولتاریہ کن بنیادوں پر مزارع سے مختلف ہوتا ہے؟

9- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو پرولتاریہ کو دست کار سے جدا کرتے ہیں؟

10- پرولتاریہ کن بنیادوں پر گھریلو دستکار یا چھوٹے پیمانے کی صنعت کے محنت کش سے مختلف ہوتا ہے؟

11- وہ کیا حالات تھے کہ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے باعث معاشرہ بورژوا اور

پرولتاریہ طبقات میں بٹ گیا؟

12- صنعتی انقلاب کے مزید کیا اثرات رونما ہوئے؟

13- ان بار بار (دوری) کے تجارتی بحرانوں سے کیا نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں؟

14- یہ نیا سماجی نظام کس قسم کا ہوگا؟

15- کیا اس سے قبل نجی ملکیت کا خاتمہ ناممکن تھا؟

16- کیا پرامن طریقہ کار سے نجی ملکیت کا انسداد ممکن ہے؟

17- اس انقلاب کا طریقہ' انداز یا راستہ کیا ہوگا؟

18- کیا یہ ممکن ہے کہ یہ انقلاب محض ایک ہی ملک میں رونما ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو سکے؟

19- نجی ملکیت کے خاتمے کے کیا دورس نتائج برآمد ہونگے؟

20- کمیونسٹ نظام کے خاندان پر کیا اثرات مرتب ہونگے؟

21- قوموں یا قومیتوں کے متعلق کمیونزم کا کیا رویہ ہوگا؟

22- مارکسزم کیا ہے؟

23- مارکس ازم' لینن ازم' اور ٹراٹسکی ازم کیا ہیں؟

24- جمہوریت اور سوشلزم بیک وقت کیسے وجود رکھ سکتے ہیں۔

25- سوشلزم کے تحت پیداوار کو سماجی کیسے بنایا جائے گا اور دولت کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟

26- بیگانگی کیا ہے؟

27- کسی عہد کے حاوی تصورات کیا ہوتے ہیں؟

28- تاریخ میں فرد کا کردار کیا ہے؟

29- سماج کی مادی بنیادیں کیا ہیں؟

30- سماجی ارتقاء کے قوانین کیا ہیں؟

31- سرمایہ دارانہ ارتکاز کا تاریخی رجحان کیا ہے؟

32- گلوبلائزیشن کیا ہے؟

33- غربت اور عدم مساوات میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟

34- ملٹی نیشنل کمپنیاں اتنی طاقتور کیوں ہیں؟

35- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے خلاف لڑا جائے؟

36- سیاٹل، پراگ، اور ونیس وغیرہ میں مظاہروں کی کیا وجوہات تھیں؟

37- کیا ایک مختلف قسم کے سماج کا قیام ممکن ہے؟

38- لوگوں کی اس سے کیا مراد ہوتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہیں؟

39- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر کسی ایک ادارے یا فرد کے خلاف لڑا جائے؟

40- انقلاب کیا ہے؟

41- انقلابی پارٹی کیا ہوتی ہے؟

42- انقلابی پارٹی کیوں ضروری ہوتی ہے؟

43- کمیونسٹ مینی فیسٹو نے سیاسی جدوجہد کے طریقہ ہائے کار کے بارے میں کیا بنیادی اصول پیش کیا تھا؟

44- سوشلزم کے ناگزیر ہونے کے بارے میں مارکس کی کیا رائے تھی؟

45- تاریخ کا مادی تصور کیا ہے؟ (لینن کی وضاحت)

46- مارکسزم کا فلسفہ (جدلیاتی مادیت) کیا ہے؟

47- طبقاتی جدوجہد کیا ہوتی ہے؟

48- مطالعے کے سلسلے میں ٹراٹسکی کا نقطہ نظر کیا تھا؟

49- انقلاب مسلسل کیا ہے؟

50- کیا سوویت یونین کے انہدام سے سوشلزم کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی؟

سوال-کمیونزم کیا ہے؟

جواب- پرولتاریہ (محنت کش) کی غیر استحصالی اور غیر طبقاتی سماج کیلئے کی جانے والی جدوجہد اور مارکسی انقلابی نظریے کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظام کو کمیونزم کہتے ہیں۔ اس میں دوسرے کا استحصال کرنے والی ملکیت یعنی نجی ملکیت کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ ذرائع پیداوار محنت کش عوام کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ہر ایک سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی ضرورتوں کے تحت اس کو دیا جاتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی محنت میں پائی جانے والی تفریق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کی مانگ یعنی ضروریات بشمول غذا' لباس' رہائش' تعلیم' صحت وغیرہ بلا تخصیص سب کو یکساں بنیادوں پر حاصل ہوتی ہیں۔ اس نظام میں بیروزگاری اور بے کاری کے الفاظ سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں۔ بیماری' بھوک' جہالت' غربت اور دیگر تمام سماجی برائیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ آزاد' خوشحال اور حقیقی انسانی سماج درحقیقت اسی نظام میں پنہاں ہے۔

سوال- پرولتاریہ کیا ہے؟

جواب- پرولتاریہ سماج کا وہ طبقہ ہوتا ہے جو ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم' اپنی بقاء اور ضروریات زندگی کے حصول کیلئے اپنی قوت محنت بیچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ کسی بھی قسم کے سرمائے' جس کا وہ خالق ہوتا ہے' میں منافع کا قطعی حقدار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اس کی خوشی وغم' زندگی اور موت غرضیکہ اس کی بقاء کا انحصار محنت کی طلب اچھے یا برے کاروبار اور بے لگام مسابقت کی متلون مزاجی پر ہوتا ہے۔ گویا پرولتاریہ یا پرولتاری طبقہ محنت کش عوام کو کہتے ہیں جو صنعتوں میں جا کر سرمایہ دار کے پاس اپنی قوت محنت بیچتے ہیں۔ یہ اصطلاح 19 ویں صدی میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔

سوال- کیا پرولتاریہ کا وجود ہمیشہ سے تھا؟

جواب-نہیں' غریب اور محنت کش ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور محنت کش اکثر و بیشتر غریب ہی رہے ہیں۔ پیداواری عمل کے دوران ذرائع پیداوار اور آلات پیداوار پر چند افراد کی ملکیت کے باعث غریب اور محنت کش طبقے کا ظہور ہوا۔ پرولتاریہ صنعتی عہد میں معرض وجود میں آیا۔ لیکن ان کی یہ حالت ازل سے نہیں تھی۔ کیونکہ آزاد اور بے لگام مسابقت بھی ہمیشہ سے موجود نہیں تھی۔

سوال- پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟

جواب- پرولتاریہ نے اس صنعتی انقلاب میں جنم لیا جو 18 ویں صدی کے وسط میں انگلینڈ میں رونما ہوا اور بعد ازاں دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد' سپننگ مشین' پاور لوم' اور دوسرے تکنیکی آلہ جات اور مشینیں صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ بنیں۔ ایک تو ایجاد شدہ مشینیں زیادہ لاگت کی حامل تھیں اور انہیں اس وقت صرف بڑے سرمایہ دار ہی تیار کروا اور خرید سکتے تھے۔ ان مشینوں نے قدیم ذرائع پیداوار اور پیداواری عمل کی جگہ لی۔ کھڈی اور چرخہ کے مقابلے میں سپننگ مشین اور پاور لوم نے زیادہ پیداوار دینا شروع کی تو پرانا نظام بتدریج ختم ہو گیا۔ اگرچہ نئے نظام کی وجہ سے جدت اور پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن ان مشینوں پر بورژوا (سرمایہ دار) طبقے کے تصرف کے باعث پوری صنعت سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور محنت کشوں کی معمولی نوعیت کی ملکیت (کھڈی اور اوزار وغیرہ) بے کار ہو گئی۔ اس کے بعد تمام چیزوں اور صنعتی عمل کو سرمایہ داروں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور محنت کشوں کو ہر طرح کے آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار سے محروم کر دیا۔ یوں کھڈی پر بنے جانے والی کپڑے کے نظام کی جگہ ٹیکسٹائل انڈسٹری نے لی اور اس طرح صنعتی نظام کا آغاز ہوا۔

کپڑے کی تیاری میں صنعتی نظام کے آ جانے سے دوسرے شعبوں کی بھی تیزی سے کایا پلٹ گئی اور وہ بھی صنعتی نظام کا حصہ بن گئے۔ جن میں فوری طور پر کتابوں کی پرنٹنگ' پوٹری اور دھات سازی کے کارخانے شامل تھے۔ محنت کو زیادہ سے زیادہ محنت کشوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے ایک ہنر مند کاریگر جو کسی بھی شے کو مکمل طور پر تیار کرنے پر قدرت رکھتا تھا اب محض اس شے کا ایک حصہ تیار

کرتا تھا۔اس سے انفرادی محنت کش کی سرگرمی نہایت سادہ اور لگا تار دہرائی جانے والی میکانکی حرکات تک محدود ہوکر رہ گئی جسے مشین من وعن بلکہ زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دے سکتی ہے۔محنت کی تقسیم کے باعث اشیاء کی تیاری اوران کی رسد میں تیزی آ گئی اور یہ کم لاگت کے باعث سستی بھی ہوتی گئیں۔جنہوں نے دست کاری اور انفرادی طور پر تیار کی جانے والی اشیاء کی جگہ لے لی۔اس طرز پیداوار میں فنی اور تکنیکی صلاحیت اور عمل با آسانی اور تواتر کے ساتھ دہرائے جاسکتے تھے۔جس کی وجہ سے پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا اور مشینوں کی بدولت اشیاء کے معیار میں بھی بہتری آئی۔اس طرح یہ سارا پیداواری عمل صنعتی نظام کے تابع ہوکر رہ گیا اور سپننگ اور ویونگ کا عمل بھاپ کی مشینوں کا مرہون منت ہوگیا۔تاہم دوسری طرف یہ ساری بڑی صنعتیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔اور محنت کشوں کی رہی سہی آزادی یا خودمختاری کا خاتمہ ہوگیا۔یوں ہنرمند کاریگر اور مینوفیکچر صنعتی نظام میں ڈھل گئے اور دست کار چھوٹے مالکان سے بڑے سرمایہ داروں کی شکل اختیار کر گئے۔انہوں نے بڑی بڑی صنعتیں اور ورکشاپیں بنالیں اور سرمایہ بچانا شروع کردیا اس طرح تقسیم محنت کا ایک نیا نظام معرض وجود میں آیا۔

اس سارے عمل کے نتیجے میں نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں تمام مزدور محنت فروخت کرنے پر مجبور ہوئے اور دست کاری ومینوفیکچرنگ کے تمام شعبے وسعت اختیار کر کے بڑی صنعت کی شکل اختیار کر گئے۔اس سارے عمل نے ایک جست لگائی اور چھوٹے دستکاروں و ہنرمندوں سمیت سابقہ مڈل کلاس یا درمیانے طبقے کو روند ڈالا۔محنت کشوں کی پرانی شکل کی ہیت وکیفیت کو بدل کر رکھ دیا اور یوں معاشرہ دوطبقوں میں بٹ گیا۔دو نئے طبقات نے جنم لیا۔جنہوں نے دھیرے دھیرے معاشرے کے دوسرے افراد کو اپنے طبقے یا صفوں میں لا کھڑا کیا۔یہ طبقات درج ذیل تھے۔

1- بورژوا (سرمایہ دار) طبقہ:

جو تمام ترقی یافتہ ممالک کے ذرائع پیداوار پر قابض ہوگئے اور خام مال وآلات (مشین، فیکٹریاں) جو پیداواری عمل کیلئے ناگزیر تھیں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔یہ طبقہ بورژوا (سرمایہ دار) کہلایا۔

2- پرولتاریہ (محنت کش) طبقہ:

اس طبقہ کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں تھا۔وہ صرف اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس فروخت کرنے پر مجبور تھے تاکہ اس کے بدلے میں زندہ رہنے کیلئے ضروری لوازمات کا تبادلہ کرسکیں اس

طبقے کو پرولتاریہ (محنت کش) طبقہ کہا گیا۔

سوال- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں کہ پرولتاریہ اپنی قوت محنت بورژوا طبقے کے پاس بیچنے پر مجبور ہو جاتا ہے؟

جواب- سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کی حیثیت محض ایک جنس کی مانند ہوتی ہے اس کی قدر کا تعین ان قوانین کی بدولت ہی ممکن ہوتا ہے جو دوسری اجناس کیلئے روبہ عمل ہوتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر صنعتی دور یا آزادانہ مقابلے کے عہد میں انسانی محنت اور جنس ایک ہی شے کی مانند ہوتے ہیں۔ کسی بھی جنس کی قیمت کا تعین اس کی پیداوار پر آنے والی لاگت اور گزر بسر کیلئے درکار ضروری لوازمات کی مقدار پر مشتمل ہوتا ہے تاکہ محنت کش کام کاج کے قابل رہیں اور بطور محنت کش طبقے کے ختم نہ ہو جائیں' اور بدلے میں ان کو صرف اتنا ہی معاوضہ دیا جاتا ہے جتنے میں وہ صرف زندہ رہ سکیں۔ اس نظام میں محنت کش طبقے کو زندہ رکھنا اس لئے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ صنعت کو متحرک رکھ سکیں اور سرمایہ دار منافع بٹور سکیں۔ وہ محنت کش کو اس کی خدمات کا معاوضہ زیادہ نہیں دیتے۔ محنت کش کو تنخواہ یا کام کے بدلے میں اجرت اس قدر کم دی جاتی ہے کہ اس کی زندگی کی سانسوں کی بقا ممکن رہ سکے اور وہ اپنی قوت محنت استعمال کر سکے۔ تاہم کاروبار کبھی اچھا ہوتا ہے کبھی خراب۔ محنت کش کو کبھی کم معاوضہ ملتا ہے کبھی زیادہ۔ بالکل اسی طرح محنت کش بھی اس کم از کم اجرت سے کم وصول کرتا ہے اور نہ زیادہ۔ جس طرح فیکٹری کا مالک اچھے اور خراب کاروبار کی اوسط کی بنیاد پر اپنی اجناس کی پیداواری لاگت سے نہ تو کم وصول کرتا ہے اور نہ ہی زیادہ' اسی طرح محنت کش بھی اس کم از کم اجرت سے نہ تو زیادہ وصول کرے گا اور نہ ہی کم۔ بڑے پیمانے کی صنعت جس قدر زیادہ پیداواری شعبوں پر غالب آتی جائے گی اجرتوں کا یہ معاشی قانون اتنی ہی شدت سے نافذ ہوگا۔ سرمایہ دار کے پاس تو ذرائع پیداوار اور آلات پیداوار ہوتے ہیں۔ جبکہ محنت کش طبقے کے پاس سوائے اپنی قوت محنت بیچنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور اسے چار و ناچار زندہ رہنے کیلئے اپنے خاندان کی کفالت کیلئے سرمایہ دار کے پاس اپنی قوت محنت بیچنا پڑتی ہے۔

سوال- صنعتی انقلاب سے پہلے محنت کش طبقے کی کیا شکل تھی؟

جواب- سماجی نشو ونما کے مختلف مدارج پر محنت کش طبقات مختلف صورتحال میں رہتے تھے اوران کے اپنے مالکوں یا حکمران طبقات کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ زمانہ قدیم میں محنت کش لوگ اپنے آقاؤں کے غلام تھے بالکل اسی طرح جیسے آج بھی کئی پسماندہ ممالک میں انسان انسانوں کے غلام ہیں۔ درمیانی دور میں محنت کشوں کی شکل مزارعوں کی تھی جو زمینوں کے مالک' اشرافیہ اور جاگیردار کے تصرف میں تھے اور آج بھی تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں ہیں۔ صنعتی انقلاب کے مکمل طور پر ظہور پذیر ہونے تک وہ کرائے کے ملازم تھے' جو قصبوں میں پیٹی بورژوا کے پاس کام کرتے تھے۔ پھر بتدریج مینوفیکچرنگ نے ترقی کی جس سے ہنرمند کاریگر پیدا ہوا اور بعدازاں صنعتی عمل میں وہ بڑے سرمایہ داروں کے تصرف میں چلا گیا۔ یوں اس نے صنعتی کارکن یا پرولتاریہ کی شکل اختیار کر لی۔

سوال- پرولتاریہ غلاموں سے کن بنیادوں پر مختلف ہے؟

جواب- غلام ایک ہی مرتبہ اور ہمیشہ کیلئے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ پرولتاریہ بھی اپنے آپ کو بیچتا ہے مگر دنوں یا گھنٹوں کے حساب سے۔ غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ جو ساری زندگی اس کے پاس رہتا ہے اس کی حالت زندگی کتنی بھی خراب کیوں نہ ہو اس کی بقاء یقینی ہوتی ہے' کیونکہ اس کے آقا کا مفاد اسی میں ہوتا ہے۔ پرولتاریہ کو اپنی زندگی اور بقاء کا تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ روزگار سمیت غذا' تعلیم اور صحت کا تحفظ نہیں ہوتا۔ سرمایہ دار جب چاہے اسے روزگار سے نکال سکتا ہے۔ اور اس کے گھر فاقوں کی نوبت آ سکتی ہے۔ بقاء کی ضمانت صرف مجموعی طور پر پورے محنت کش طبقے کو حاصل ہوتی ہے۔ غلام ہمیشہ مقابلے بازی سے باہر رہتا ہے۔ جبکہ پرولتاریہ مقابلے بازی کے چنگل میں بری طرح پھنسا ہوتا ہے اور اس سے منسوب تمام ذلتوں کا شکار بھی ہوتا ہے۔ غلام کی شکل سماج میں ایک شے کی مانند ہوتی ہے نہ کہ انسان کی۔ جبکہ پرولتاریہ ایک تسلیم شدہ سماجی فرد ہوتا ہے اور ایک معاشرے کا رکن بھی۔ غلام کو پرولتاریہ کی نسبت بقاء کی بہتر ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی ذمہ داری اس کے آقا پر ہوتی ہے۔ جبکہ پرولتاریہ سماجی

نشو ونما میں اعلیٰ مرحلے سے تعلق رکھنے کے باوجود روزگار سمیت دوسری بنیادی ضرورتوں کے عدم تحفظ کا شکار رہتا ہے۔ غلام اسی وقت اپنے آپ کو آزاد کرا سکتا ہے جب نجی ملکیت کے رشتوں میں محض غلامی کے رشتے کو مٹایا جائے۔ تب وہ پرولتاریہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پرولتاریہ اپنے آپ کو صرف اسی وقت اور صرف اسی صورت میں آزاد کراتا ہے جب وہ کلی طور پر ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہی کو ختم کرتا ہے۔

سوال- پرولتاریہ کن بنیادوں پر مزارع سے مختلف ہوتا ہے؟

جواب- جاگیردارانہ نظام میں محنت کش کو مزارع کہتے ہیں۔ مزارع کے پاس زمین کا قطعہ ہوتا ہے۔ جس کو وہ پیداواری مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔ تاہم وہ اس کے بدلے میں پیداوار یا محنت کا بڑا حصہ اپنے مالک یعنی جاگیردار کو دینے کا پابند ہوتا ہے۔ پرولتاریہ جن جدید آلات پیداوار کے ساتھ کام کرتا ہے وہ ان کا مالک نہیں ہوتا مگر وہ اپنی پیداوار کے بدلے میں اجرت وصول کرتا ہے۔ مزارع کچھ دیتا ہے جبکہ پرولتاریہ وصول کرتا ہے۔ مزارع کی بقاء یقینی ہوتی ہے پرولتاریہ کی نہیں ہوتی۔ پرولتاریہ کے پاس متبادل کچھ نہیں ہوتا۔ مزارع آزادانہ مقابلے کی دوڑ سے باہر ہوتا ہے۔ جبکہ پرولتاریہ مقابلے کے دنگل کا حصہ بنتا ہے۔ ایک مزارع اسی وقت اپنے آپ کو آزاد کراتا ہے جب وہ بھاگ کر قصبے یا شہر میں جا کر صنعتی نظام کا حصہ بنے۔ اور وہاں ایک ہنرمند یا دستکار کی شکل اختیار کرے۔ یا پھر اپنے مالک یعنی جاگیردار کو پیداوار یا نقد رقم دے تب وہ ایک آزاد مزارع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے آزاد ہونے کی صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ جاگیردار کو مار بھگائے اور بذات خود قطعات زمین کا مالک بن بیٹھے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک دوسری صورت میں مالکوں کے طبقے اور دوڑ میں شامل ہو۔ اس کے برعکس پرولتاریہ اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں آزاد کرا سکتا ہے جب وہ مقابلے کی دوڑ کا خاتمہ کرے نجی ملکیت اور طبقاتی تقسیم کی ہر شکل کو مٹا دے۔

سوال- وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو پرولتاریہ کو دست کار سے جدا کرتے ہیں؟

جواب- ہنرمند دست کار جو 18 ویں صدی تک کرہ ارض پر ہر جگہ موجود تھا۔ آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ جزوی یا عارضی طور پر ایک پرولتاریہ ہوتا ہے مگر اس کا منشا ہائے مقصد سرمائے کا حصول ہوتا ہے تاکہ وہ اس بل بوتے پر دوسرے محنت کش کا استحصال کر سکے اور سرمائے میں اضافہ کر سکے۔ اکثر و بیشتر وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں گھریلو صنعت ابھی تک اپنا وجود رکھتی ہے یا جہاں انفرادی پیداوار نے اس قدر آزادی نہیں دی کہ دست کاری کا عمل یا نظام سماجی صنعت میں تبدیل ہو جائے اور تا حال اس نے خوفناک مقابلہ کی شکل اختیار نہ کی ہو۔ وہاں دستکار موجود ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں دست کاری کے نظام کی جگہ صنعتی نظام پروان چڑھا وہاں مقابلے کا رجحان پیدا ہوا۔ تب دستکاروں نے اپنے آپ کو یا تو مڈل کلاس میں بدل کر یا سرمایہ دار بن کر آزاد کرالیا۔ یا پھر وہ مقابلے کی دوڑ (صنعتی عمل) میں شامل ہو کر پرولتاریہ کی شکل اختیار کر گئے۔ اب وہ اپنے آپ کو صرف پرولتاریہ کی منظّم تحریک سے جوڑ کر استحصالی نظام سے چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے۔ جو کہ آخری تجزیے میں کم و بیش شعوری بنیادوں پر چلنے والی کمیونسٹ یا مزدور تحریک میں شمولیت کے نتیجے میں ممکن ہے۔

سوال- پرولتاریہ کن بنیادوں پر گھریلو دستکار یا چھوٹے پیمانے کی صنعت کے محنت کش سے مختلف ہوتا ہے؟

جواب- 16 ویں صدی سے لیکر 18 ویں صدی تک گھریلو دستکار پیداواری آلات کا مالک رہا ہے۔ اس کے پاس کھڈی، چرخہ اور دوسرے آلات سمیت زمین کے چھوٹے قطعات بھی ہوتے تھے۔ جہاں وہ فارغ اوقات میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ لیکن پرولتاریہ کے پاس آلات پیداوار سمیت کچھ نہیں ہوتا۔ گھریلو دستکار ہمیشہ اپنے سردار یا سربراہ سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آقا یعنی مالک یا ملازم کے ساتھ پیداواری رشتہ استوار کرتا ہے۔ اس کے برعکس پرولتاریہ بڑے قصبوں یا

شہروں میں جہاں صنعت ہوتی ہے' قیام پذیر ہوتا ہے۔اس کا تعلق اپنے آجر کے ساتھ کیش یا نقد رقم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔گھریلو دستکار وسیع پیمانے پر پھیلتی ہوئی صنعت کے تابع ہوکر اپنی ملکیت کھو دیتا ہے اور پرولتاریہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سوال- وہ کیا حالات تھے کہ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے باعث معاشرہ بورژوا اور پرولتاریہ طبقات میں بٹ گیا؟

جواب- اول' مشینوں نے جب صنعت میں پیداواری عمل کی جگہ لی تو اشیا کی قیمتیں کم سے کم ہونا شروع ہوئیں۔جس کے باعث دستکار یا ہاتھ سے بنائی جانے والی اشیاء کا نظام مٹ گیا۔ اس طرح نیم بربریت والے ممالک جو تاریخی ارتقاء سے بیگانہ تھے اور جن کا معاشی دارومدار اس وقت مینوفیکچرنگ پر تھا اپنی تنہائی سے جبراً باہر نکالے گئے۔انہوں نے انگریزوں کی تیارشدہ اشیاء جو نسبتاً سستی تھیں کو مارکیٹ میں آنے دیا اور اپنے دستکاروں کو تباہ کر دیا۔وہ ممالک جن میں ہزاروں سال سے کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی نئے انقلاب اور تبدیلی کے عمل کی زد میں آ گئے۔انڈیا اور چین میں بھی یہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔انگلینڈ میں تیار ہونے والی ایک ایک مشین نے لاکھوں دستکاروں اور مینوفیکچرر کی جگہ لے لی اور ان کی مارکیٹ چھین لی۔صنعت کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ سے کراہ ارض پر آباد تمام لوگوں کے ایک دوسرے سے روابط استوار ہوئے اور بتدریج تمام چھوٹی اور بڑی منڈیاں ایک بین الاقوامی منڈی میں بدل گئیں۔صنعتی انقلاب کی بدولت ترقی اور تہذیب کے نئے دروازے کھل گئے۔ترقی یافتہ اور قدرے بلند تہذیب یافتہ ممالک سے بہت کچھ کم ترقی یافتہ اور پسماندہ تہذیب کے حامل ممالک میں منتقل ہوا۔اس سے یہ بات یقینی ہوگئی کے ترقی یافتہ ممالک میں جو کچھ بھی ہوگا اس کے اثرات تمام ممالک پر مرتب ہونگے۔یہی وجہ ہے کہ آج اگر انگلینڈ یا فرانس کے محنت کش انقلاب برپا کرتے ہیں تو اس کا براہ راست اثر دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پڑے گا اور جلد یا بدیر وہاں بھی انقلابات جنم لیں گے۔جس کے نتیجے میں محنت کشوں کی حقیقی معنوں میں آزادی اور ترقی کا عمل شروع ہو جائے گا۔

دوئم' وسیع پیمانے پر صنعتی نظام نے مینوفیکچرنگ کی جگہ لی تو صنعتی انقلاب نے بورژوا (سرمایہ

داروں) کوجنم دیا وراس کی دولت اور طاقت کوانتہا تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ اسے ملک کے اولین مراعات یافتہ طبقے میں بدل دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بورژ وا طبقہ نے سیاسی طاقت اور اقتدار کوا پنے ہاتھوں میں لیکر اشرافیہ اور جاگیرداروں کوحکمرانی سے محروم کر دیا اوران کی تمام طاقت اور اداروں کومسمار کر دیا۔ان سے زمینوں سمیت دیگر مراعات چھین لیں۔ گھریلو صنعت اور دستکار کوان کے استحقاق سے محروم کر کے انہیں تباہ کر دیا۔اوران کی جگہ وسیع وعریض صنعتی نظام کو بروئے کار لاتے ہوئے آزادانہ مقابلے کی فضا کو پروان چڑھایا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی کہ سماج کے ہرفرد کوکسی نہ کسی طرح اس نظام یا صنعتی عمل کا حصہ بننا پڑااورایسےعوامل کو جوسرمائے کے نئے نظام میں رکاوٹ کا باعث تھے نیست ونابود کر دیا گیا۔آزاد مقابلے کے رجحان میں اس بات کا سرعام اعلان کیا گیا کہ سماج کے تمام افراد اس لئے برابر نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمایہ برابر نہیں ہے اور یوں زیادہ سرمائے کے حامل افراد بورژوا سماج کا اعلیٰ طبقہ بن گئے۔سرمایہ داری نظام میں صنعت کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ اور مقابلے کا رجحان اس لئے ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ وہ واحد سماجی کیفیت یا حالت ہوتی ہے جس میں صنعت سازی کا وسیع تر عمل اپنی جگہ بناتا ہے۔گلڈ ماسٹر اور امراء کی سماجی طاقت و حیثیت کو معدوم کرنے کے بعد بورژوازی نے ان کی سیاسی طاقت کوختم کر دیا۔سماج میں اولین مقام حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سیاست میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا۔صنعت اور آزادانہ مقابلے کی شکل کو قانونی حیثیت دے دی اور بعد ازاں تمام ملکوں اور ریاستوں کے آئین کا جزو لاینفک بنا دیا گیا۔سیاسی عمل میں انتخابات اور نمائندگی کا طریقہ کار متعارف کرایا گیا۔جو بورژوا مساوات پرمبنی تھا۔ یورپ میں اس نے آئینی بادشاہت کی شکل اختیار کی جس میں ووٹ ڈالنے کا حق صرف اس کو تھا جس کے پاس سرمایہ ہوتا۔گویا سرمایہ دار ہی ووٹ ڈالنے اور انتخابات میں حصہ لینے کا اہل تھا۔ یہ بورژوا مقابرین کومنتخب کرتے ہوئے قانون سازی اور ٹیکس کے عمل کی تشکیل کرتے ہوئے ایک بورژوا حکومت کا قیام عمل میں لاتے تھے۔

سوئم، تمام جگہوں پر برپا ہونے والے صنعتی انقلابات نے پرولتاریہ کوایک ہی طرح پروان چڑھایا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے بورژوا طبقے کوارتقائی عمل کے دوران نشو ونما اور ترقی دیکر پروان چڑھایا۔ پرولتاریہ بھی اپنی تعداد کے اعتبار سے اسی نسبت سے بڑھتا گیا۔ کیونکہ سرمایہ کاری ہی پرولتاریہ کی تعداد میں اضافہ کرسکتی تھی۔ لہذا جوں جوں سرمایہ اور صنعت کا عمل بڑھتا گیا پرولتاریہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔اسی طرح بورژوا اور پرولتاریہ بڑے شہروں میں منتقل ہوتے

گئے جہاں صنعتیں زیادہ سے زیادہ منافع بخش ہوتی ہیں اور یوں عوام کی بہت بڑی تعداد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔اسی عرصے میں ایک ہی صنعت' ایک ہی جگہ رہنے سے پرولتاریہ کو اپنی اجتماعی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔مزید برآں یہ طریقہ جہاں زیادہ ترقی کرتا ہے وہاں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی جگہ مشینوں سے کام لینے کا عمل تیز تر ہوتا ہے۔وسیع پیمانے پر صنعتی پھیلاؤ وقوع پذیر تو ہوتا ہے لیکن پرولتاریہ کی اجرتیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں۔ان کے شب و روز کٹھن اور بیروزگاری پھیل جاتی ہے اور حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں جو کہ پرولتاریہ کیلئے ناقابل برداشت بن جاتے ہیں۔تب ایک طرف پرولتاریہ کی بے اطمینانی اور دوسری طرف اس کی بڑھتی ہوئی طاقت اسے اپنے حالات بدلنے پر مجبور اور آمادہ کرتی ہے اور وہ انقلاب کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔تب یہی صنعتی انقلاب پرولتاری سماجی انقلاب کا باعث بن جاتا ہے۔

سوال-صنعتی انقلاب کے مزید کیا اثرات رونما ہوئے؟

جواب- بھاپ کے انجن کی ایجاد اور دوسری مشینیں وسیع پیمانے پر جنم لینے والے صنعتی نظام کا باعث آغاز بنی اور محدود وقت میں کم لاگت پر صنعتی پیداوار میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور اس پیداوار کے باعث وسیع پیمانے پر صنعتی نظام اور آزادانہ مقابلہ کی روش نے انتہائی حدوں کو چھوا۔سرمایہ داروں کی بہت بڑی تعداد صنعت سازی کے عمل میں کود آئی۔پیداواری عمل میں تیزی کے باعث ضرورت سے زیادہ اشیاء مارکیٹ میں آ گئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیار شدہ چیزیں مارکیٹ میں بک نہیں سکیں۔ایک نام نہاد تجارتی بحران پھوٹ پڑا۔جس کی بدولت فیکٹریاں بند ہو گئیں ان کے مالک دیوالیہ ہو گئے اور محنت کشوں سے روٹی کا نوالہ چھن گیا۔ہر طرف کساد بازاری اور بدحالی چھا گئی۔

کچھ عرصے بعد فاضل پیداوار فروخت کے قابل ہو گئی۔کارخانے دوبارہ چلنا شروع ہو گئے۔اجرتوں میں اضافہ ہوا اور پھر بتدریج کاروبار پہلے کی نسبت بہتر ہو گیا۔تاہم یہ صورتحال زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہی اور پھر اشیا ضرورت فاضل پیداوار کی شکل میں مارکیٹ میں آ گئیں اور ایک نیا بحران شروع ہو گیا جس طرح پہلے آیا تھا۔19 ویں صدی کے آغاز سے لیکر آج تک سرمایہ داری اپنے عروج و زوال یعنی بحرانی کیفیت سے گزرتی رہی اور تقریباً ہر 5 سے 7 سال

کے وقفے کے بعد یہ بحران تواتر کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے رہے جس کے باعث محنت کشوں کی زندگیاں اجیرن بنتی رہیں۔ اس صورتحال میں پورے نظام کی بقاء کو انقلابات کے عمومی رجحانات سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔

سوال-ان بار بار (دوری) کے تجارتی بحرانوں سے کیا نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں؟

جواب- اول' وسیع پیمانے کی صنعت سازی کے عمل نے آزادانہ تجارتی مقابلے کے رجحان کو جنم دیا اور اب سرمایہ داری آزادانہ مقابلے کی حدود پھلانگ چکی ہے۔ وسیع پیمانے پر صنعت سازی میں مقابلے اور عمومی طور پر صنعتی پیداوار کی انفرادی تنظیم لازمی طور پر جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر بالآخر بند ہو جاتی ہے۔ جب تک بڑے پیمانے کی صنعت اپنی موجودہ کیفیت میں چلتی ہے وہ صرف اسی صورت میں اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے جب یہ وقفے وقفے سے آنے والے پے در پے بحرانوں کی قیمت چکائے یا ان کو برداشت کرے۔ لیکن بحران صرف سماج کی تہذیب و ثقافت کی تباہی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ پرولتاریہ کے ناسازگار حالات زندگی سمیت بورژوا طبقے کو بھی دیوالیہ کر دیتا ہے گویا ان بحرانوں سے بچنے کیلئے یا تو صنعت سازی کے سلسلے کو ترک کیا جائے جو مکمل طور پر ناممکن ہے یا پھر یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ایک بالکل نئی سماجی تنظیم' سماجی نظام کو نئے سرے سے چلائے جس میں صنعتی پیداوار کو اس کے مالکوں کے مابین آزادانہ مقابلے کی بنیاد پر نہ رکھا جائے بلکہ پورے سماج کی مجموعی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک منظّم منصوبہ بندی اور ہر فرد کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ پیداواری عمل جاری رکھا جائے۔

دوئم' وسیع پیمانے پر صنعت سازی اور پیداوار کے لامحدود پھیلاؤ کے باعث یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا سماجی نظام قائم کیا جائے جس میں ضروریات زندگی کیلئے اتنی وافر مقدار میں پیداوار حاصل کی جاسکے کہ سماج کا ہر فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک مکمل آزادانہ ماحول میں کام کر سکے۔ گویا وسیع پیمانے پر صنعت سازی اور پیداواری گنجائش کے باوجود سماجی ابتری اور تجارتی بحران کی اصل وجہ نئی سماجی تنظیم اور نئے نظام کا نہ ہونا ہے۔ اگر پرانے نظام کی جگہ نئے نظام اور صنعتوں کو چلانے کیلئے نئی سماجی تنظیم کو معروض وجود میں لایا جائے تو ساری بدحالی' کساد

بازاری' بحران اور سماجی ابتری دم توڑ جائے گی۔

لہذا واضح ہو جاتا ہے کہ:

1 - تمام سماجی برائیاں (بھوک' غربت' جہالت 'پسماندگی' بیماری' بیروزگاری وغیرہ) اس سماجی نظام کی بدولت ہیں جو موجودہ صورتحال سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

2 - ایک نئے سماجی نظام کے ذریعے اپنی تمام سماجی برائیوں کے خاتمے کیلئے پیداواری عمل کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی ضرورت ہے ایسے مواقع اور حالات مکمل طور پر تیار ہیں کہ ان تمام برائیوں کو ایک نئے سماجی نظام کے ذریعے مکمل طور پر ختم کیا جا سکے۔

سوال- یہ نیا سماجی نظام کس قسم کا ہوگا؟

جواب- اس نظام کے تحت سب سے پہلے صنعتوں اور پیداوار کے دوسرے تمام شعبوں پر انفرادی یا سرمایہ داروں کی دسترس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس نئے نظام کے تحت یہ کارخانے پورا سماج باہم مل کر مشترکہ بنیادوں پر چلائے گا' جس کی بنیاد مشترکہ منصوبہ بندی اور سماج کے ہر فرد کی بلا امتیاز اور بلا تخصیص شرکت ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ مقابلے کے رجحان کا خاتمے کر کے اس کی جگہ جڑت کو دے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں صنعتوں کی انفرادی یا سرمایہ داروں کے دسترس کے باعث فرد کے پاس نجی ملکیت آ گئی ہے جس کے لازمی نتائج منافع' ہوس اور تباہی ہوتے ہیں۔ مقابلے کے رجحان کے باعث پوری صنعت محض افراد کے پاس چلی جاتی ہے' جس کا مطلب یہ ہوا کہ نجی مسابقت اور صنعت کے انفرادی انتظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا نجی ملکیت کی ہر شکل کو مسمار کر کے اس کی جگہ پیداواری عمل میں اشتراکی بنیادوں پر سماجی تنظیم کو پروان چڑھایا جائے اور تمام پیداوار کو باہمی سمجھوتے کے تحت استعمال کیا جائے یعنی اشیا کو مشترکہ ملکیت میں لیا جائے۔ مختصر الفاظ میں اشیا پر نام نہاد ملکیت کا خاتمہ درحقیقت نجی ملکیت کے خاتمے سے ہی ممکن ہے اور یہ واحد ناگزیر اور قابل عمل طریقہ ہے جس سے پورا سماجی نظام بدل جاتا ہے اور جسے صنعت کی ترقی نے ضروری بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ ہمیشہ یہ کہنے میں حق بجانب رہے ہیں کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کئے بغیر انقلاب' نیا سماجی نظام اور ترقی ممکن نہیں۔

سوال- کیا اس سے قبل نجی ملکیت کا خاتمہ ناممکن تھا؟

جواب- ہاں' سماجی نظام میں ہرنو کی تبدیلیاں' ملکیتی رشتوں میں ہرانقلاب' اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ نئی پیداواری قوتوں کوفروغ دیا جاسکے' جو کہ پرانے پیداواری نظام اور ملکیتی رشتوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ نجی ملکیت نے بذات خود اسی طرح جنم لیا۔ نجی ملکیت ہمیشہ تو نہیں تھی۔ جب ہم عہد وسطیٰ کے آخر کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں ہمیں پیداوار کے نئے طریقے مینوفیکچرنگ کی شکل میں ابھرتے ہوئے ملتے ہیں۔ جو کہ اس وقت جاگیردار یا دستکار کی ملکیت کے تابع نہیں ہو سکتے تھے۔ اس طرح مینوفیکچرنگ نے پرانے ملکیتی رشتوں سے جنم لیا اور اسی طرح ملکیت کی ایک نئی شکل کو جنم دیا جو نجی ملکیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔

مینوفیکچرنگ اور وسیع پیمانے پر صنعتی ترقی کے پہلے مرحلے میں نجی ملکیت ہی واحد ممکنہ ملکیتی شکل تھی اور اس پر منحصر سماجی نظام ہی واحد ممکنہ سماجی نظام تھا۔ جب تک یہ ممکن نہیں تھا کہ پیداوار اتنی کی جائے جو سب کیلئے کافی ہو تو کچھ زائد یا فاضل پیداوار کے ذریعے سماجی سرمائے میں اضافہ اور پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کیلئے ایک غالب طبقے کی ضرورت تھی۔ جس کی جگہ بورژوا نے لی۔ اس کے برعکس پیداواری قوتوں سے باہر سماج میں دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی جو آلات پیداوار کو متحرک رکھ سکیں' جو ایک غریب اور استحصال زدہ طبقہ نے لی اور یوں ایک راستے کا تعین ہوا۔ جس کے تحت یہ طبقات باہم پیداواری رشتے میں اکٹھے ہوئے۔ طبقاتی ساخت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ پیداوار کس مرحلے پر ہے۔ درمیانی عہد میں پیداوار کا انحصار زراعت پر تھا اور اس عمل کے دوران جاگیردار اور مزارع نے جنم لیا اس عہد کے اختتامی دور میں ہمیں مختلف قصبوں اور شہروں میں گلڈ ماسٹر اور نیز دیہاڑی دار مزدور ملتا ہے۔ سترویں صدی میں گھریلو صنعت اور گھریلو دستکار نظر آتے ہیں۔ جب کہ 19 ویں صدی میں پیداواری قوتوں کا پھیلاؤ ایک بےنظیر سطح تک عمل میں آیا اور آج ایسے ذرائع موجود ہیں کہ انہیں انتہائی کم وقت میں مزید فروغ دیا جاسکتا ہے۔ دوسرا جب یہ پیداواری قوتیں چند بورژوا حضرات کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہوں اور عوام کی بہت بڑی تعداد پرولتاریہ میں بدل چکی ہو سرمایہ داروں کی دولت میں بےتحاشا اضافہ اور عوام کی حالت زار انتہائی گھمبیر اور ناقابل برداشت ہو چکی ہو۔ سوئم' یہ زبردست اور باآسانی فروغ پانے والی پیداواری قوتیں نجی ملکیت اور بورژوازی کی حدود سے اس قدر آگے بڑھ چکی ہیں کہ وہ کسی بھی

وقت سماجی نظام میں زبردست ہل چل پیدا کرسکتی ہیں۔ اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ نجی ملکیت کے خاتمہ کے نہ صرف امکانات پیدا ہو چکے ہیں بلکہ یہ عمل ہر حالت اور ہر صورت میں لازمی اور ناگزیر ہے۔

سوال- کیا پرامن طریقہ کار سے نجی ملکیت کا انسداد ممکن ہے؟

جواب- اگر پرامن بنیادوں پر ایسا ممکن ہوتا تو اس کی خواہش ضرور کی جاتی اور کمیونسٹ اس کی مخالفت کرنے والوں کی صف کے تابع نہیں ہوتے۔ کمیونسٹ جانتے ہیں کہ تمام تر سازشیں نہ صرف بے معنی ہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہیں۔ وہ اس بات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ انقلابات خواہشات کے باغ نہیں ہوتے اور نہ ہی خواہشات کرنے سے انقلاب برپا ہوتے ہیں یا نہ ہی مصنوعی طریقے سے انقلاب درآمد کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہر جگہ اور تمام اوقات میں وہ ناگزیر وجوہات اور لازمی حالات ہوتے ہیں جو انقلاب کا باعث بنتے ہیں۔ یہ حالات خواہشات' انفرادی جدوجہد بلکہ طبقات سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شاید عام ہے کہ کم وبیش تمام تہذیب یافتہ ممالک میں پرولتاریہ کے ارتقاء کو بزور طاقت دبایا گیا ہے۔ اس طریقہ سے کمیونسٹوں کے مخالفین بھی اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ انقلاب کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اگر استحصال زدہ پرولتاریہ کو انقلابی عمل میں شرکت پر مجبور کر دیا جاتا ہے تب کمیونسٹوں کیلئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ پرولتاریہ کے مقاصد کا دفاع عمل کی دنیا میں اس طرح کریں جس طرح قبل ازیں وہ نظریات یا الفاظ کے ذریعے کرتے آئے ہیں۔

سوشلسٹ انقلاب میں نجی ملکیت کا انسداد پرامن طریقے سے ممکن ہے لیکن حکمران اپنے متروک نظام کو بچانے کیلئے ناگزیر طور پر تشدد کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ریاست کا یہی مقصد ہے لیکن حکمرانوں کے ذرائع ابلاغ اور حاوی سماجی رجحانات تمام تشدد کا ذمہ ایک بہتان کی صورت میں پرولتاریہ اور انقلاب پر ڈال دیتے ہیں۔

سوال- اس انقلاب کا طریقہ، انداز یا راستہ کیا ہوگا؟

جواب- پرولتاری انقلاب میں سب سے پہلے مالیاتی سرمائے کی آمریت کو ختم کر کے ایک حقیقی جمہوری آئین کو روبہ عمل لاتے ہوئے بالواسطہ یا بلاواسطہ پرولتاریہ کی سیاسی حکمرانی قائم کی جائے گی۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں عوام کی اکثریت پرولتاریہ میں بدل چکی ہے اور جبکہ بعض ممالک میں عوام کی اکثریت صرف پرولتاریہ پر ہی مشتمل نہیں بلکہ کسان اور پیٹی بورژوا بھی ان کے ساتھ شامل ہیں وہ بھی اب پرولتاریہ کی شکل میں ڈھل رہے ہیں۔ تاہم انکے مفادات بھی پرولتاریہ کے مفادات سے جڑے ہوتے ہیں اور وہ اپنے سیاسی مفادات کیلئے پرولتاریہ کی جدوجہد پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ لہذا ان کیلئے پرولتاریہ کے مطالبات کو اپنانا لازمی ہوتا ہے۔ ایسی جمہوریت پرولتاریہ کیلئے مکمل طور پر بے معنی ہوگی جس میں فوری طور پر نجی ملکیت کے خاتمے اور پرولتاریہ کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی ضمانت فراہم نہ ہو۔ رائج الوقت رشتوں کے لازمی نتیجے کے طور پر سامنے آنے والے چیدہ چیدہ اقدامات مندرجہ ذیل ہیں۔

1- نجی ملکیت کو بڑھتے ہوئے ٹیکسوں کے ذریعے محدود تر کرنا۔ وراثتی ملکیت کا خاتمہ۔ عالمی مالیاتی اداروں کے قرضہ جات کی واپسی سے انکار اور دوسرے اقدامات۔

2- تمام بھاری صنعت، اور حاوی صنعت، زراعت اور مالیاتی اداروں کی ضبطگی۔ زمینوں، فیکٹریوں، ریلوے، بینکوں اور جہازوں کے مالکان کی بے دخلی۔

3- اکثریتی عوام یعنی پرولتاریہ کے مخالف اور ترک وطن کرنے والے باغیوں کی جائیداد کی مکمل ضبطگی۔

4- زمینوں، فیکٹریوں اور ورکشاپوں کو محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں دینا، صنعتوں میں محنت کشوں کے درمیان مقابلے کے رجحان کا قلع قمع کرنا۔

5- صنعتی عمل کو تیز تر کرنے کیلئے ہنرمند کارکنوں کی فوج تیار کرنا اور خاص کر زراعت کے شعبے میں جدید سائنسی تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زیادہ پیداوار حاصل کرنا۔

6- مالیاتی نظام کو مرکز کے تابع کرنا اور تمام امور ریاست کے ہاتھ میں لینا۔ ریاستی سرمائے سے ایک نیشنل بینک کا قیام جو مالیاتی امور کی مکمل نگرانی کرے، نجی بینکوں کی مکمل بندش۔

7- قومی صنعتوں میں ترقی، ورکشاپوں، ریلوے اور بحری جہازوں میں بہتری اور ترقی۔

نئے قطعات زمین کو زیر کاشت لانا اور پہلے سے زیر کاشت رقبے میں مزید بہتری لانا۔

8- طبقاتی نظام تعلیم کا مکمل خاتمہ یکساں نصاب اور معیاری تعلیم کا اجراء۔تمام بچوں کو تعلیم دینا' ان کی تعلیم کا آغاز فوراً ہی اس وقت شروع کرنا جب وہ اپنی ماؤں کی دیکھ بھال یا ضرورت سے فراغت پالیں۔قومی سطح پر تعلیم اور پیداواری عمل دونوں کو باہم طریقے سے چلانے کا وسیع پیمانے پر انتظام۔

9- صنعت اور زراعت سے وابستہ افراد کیلئے قومی زمین پر جدید مشترکہ رہائش گاہوں کی تعمیر اور ان کی طرز زندگی میں شہری اور دیہی دونوں کے مفید پہلوؤں کی آمیزش تاکہ یکطرفہ پن ختم ہو اور خامیوں کو دور کیا جاسکے۔

10- صحت' علاج' تعلیم اور دوسری بنیادی ضروریات کا مفت اجراء کیونکہ یہ مراعات نہیں بلکہ کسی بھی مہذب معاشرے میں انسان کا بنیادی حق ہوتی ہیں۔ٹرانسپورٹیشن کے تمام ذرائع کو قومی تحویل میں لینا۔

اس عمل میں ایک قدم اٹھانے سے دوسرا اس کی تقلید کرے گا۔اس عمل میں سب سے پہلے نجی ملکیتوں پر ایک بھرپور حملہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے پھر پرولتاریہ آگے بڑھنے پر مجبور ہوگا اور بعدازاں وہ سارے سرمائے' زراعت' صنعت' ٹرانسپورٹ' تجارت اور دوسرے شعبوں کو ریاست کے کنٹرول میں لانے پر توجہ مرکوز کردے گا' جو محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں ہوتی ہے۔ان عوامل کی مرکزیت کے باعث ترقی کے عمل پر ایک دوررس اثر پڑتا ہے اور جس طرح پرولتاریہ کی شب وروز محنت اور جمہوری نظام کے باعث پیداواری قوتیں ترقی کرتی ہیں اسی طرح یہ تمام شعبے بھی ترقی کرتے ہیں۔بالآخر جب سارا سرمایہ' تمام پیداوار اور دیگر کاروبار عوام کے مشترکہ ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں تو نجی ملکیت کا انہدام ہوجاتا ہے۔روپیہ پیسہ بے معنی ہوجائے گا اور پیداوار کا مقصد جب منافعے کی ہوس سے ضروریات زندگی کی فراہمی میں تبدیل ہوجائے گا تو پیداوار اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ انسان کی حالت مکمل طور پر بدل جائے گی۔انسان کی حالت بدلنے سے سماجی تعلقات کی آخری پرانی شکل بھی بدل کر رہ جائے گی۔

سوال- کیا یہ ممکن ہے کہ یہ انقلاب محض ایک ہی ملک میں رونما ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو سکے؟

جواب-نہیں' بین الاقوامی منڈی کا جنم اور وسیع پیمانے پر صنعتی ارتکاز کے باعث کرہ ارض پر آباد تمام انسان ایک دوسرے سے باہم منسلک ہیں اور خاص کر ترقی یافتہ ممالک میں سماجی ترقی کے باہمی ربط نے سماج کو اس نہج پر پہنچا دیا ہے جہاں عوام بورژوا اور پرولتاریہ دو واضح اور فیصلہ کن طبقات میں بٹ چکے ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان تضاد' جاری کشمکش اور جدوجہد ہی درحقیقت آج کے دور یا اس عہد کی جدوجہد ہے لہذا کمیونسٹ انقلاب کو محض ایک ملک یا قوم کے اندر محدود کر کے بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ اس کی نوعیت کا انحصار کسی بھی ملک کی صنعت سازی کے عمل میں تیزی' سرمائے کا ارتقاء اور دوسرے عوامل پر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کسی نسبتاً کم ترقی یافتہ ممالک میں مشکل سے رونما ہوگا تو ترقی یافتہ ملک میں تیزی سے رونما ہوگا۔ جس کے اثرات بہت ہی تیزی سے دوسرے ممالک پر پوری طاقت اور تمام تر توانائی سے پڑیں گے۔ یہ انقلاب ان کے ترقی کے عمل کو تیز تر کر دے گا۔ یہ عالمگیر انقلاب ہے اور اس کی نوعیت بھی عالمی ہے' اس کا دائرہ کار بھی عالمی ہے۔

یہ درست ہے کہ پوری دنیا میں ایک وقت میں عالمی انقلاب برپا نہیں ہوگا۔ لازمی طور پر یہ کسی ایک قومی ریاست میں برپا ہوگا۔ لیکن یہاں طویل عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس کو پھیلانا ہوگا ورنہ ایک ملک میں اس کا زوال پزیر ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن کسی ایک سماج میں ابھرنے والا انقلاب عالمی انقلاب کا انتظار نہیں کر سکتا بلکہ اس ملک میں برپا ہو کر دوسرے ممالک میں انقلابی عمل کو تیز کرنے اور تقویت بخشنے کا موجب بنے گا۔

درحقیقت کسی بھی ملک میں کامیاب انقلاب کا آغاز دوسرے ممالک اور باقی دنیا پر ایک فیصلہ کن اثر چھوڑے گا۔ یہ دنیا ماضی کی نسبت کہیں زیادہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے' گلوبلائزڈ ہے۔

سوال-نجی ملکیت کے خاتمے کے کیا دورس نتائج برآمد ہونگے؟

جواب- محنت کش عوام تمام پیداواری قوتوں' تجارت کے ذرائع اور اشیاء کی تقسیم اور تبادلے کے متعلق تمام امور کو انفرادی ہاتھوں سے اپنی مشترکہ ملکیت میں لے لیں گے اور پورے معاشرے کی ضروریات اور دستیاب وسائل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کے تحت انتظامات کریں گے۔اس طریقے میں سب سے اہم پیش رفت یہ ہوگی کہ موجودہ وسیع پیمانے پر چلنے والی صنعت جو انفرادی ملکیت کی وجہ سے منفی نتائج کا باعث ہے کا مکمل خاتمہ ہو جائیگا اور پھر بحران نہیں آئیں گے۔ فاضل پیداوار اور جو موجودہ نظام کے اندر زائد پیداوار گردانی جاتی ہے اور اس کے باعث اقتصادی بدحالی اور بحران جنم لیتا ہے۔ یہ فاضل پیداوار بے کار اور بے معنی نہیں ہوگی بلکہ اسے مزید وسعت دی جائے گی۔ فاضل پیداوار بحران اور بدحالی کا باعث بننے کی بجائے معاشرے کے ہر فرد کی ضروریات کو مکمل تحفظ فراہم کرے گی اور نئے ذرائع پیداوار تخلیق کرنے کا باعث بھی ہوگی اس کی وجہ سے ترقی کے نئے ادوار شروع ہونگے جو بغیر کسی تغیر یا وقفے کے جاری و ساری رہیں گے۔مگر یہ سارا عمل موجودہ (سرمایہ دارانہ) سماجی نظام کو منہدم کرنے سے ہی ممکن ہوگا۔

وسیع پیمانے پر صنعت سازی نجی ملکیت کے دباؤ سے آزاد ہو جائے گی اس میں اسی پیمانے کی وسعت آئے گی جیسی گھریلو دستکاری کے مقابلے میں جدید صنعت میں آئی تھی۔صنعت میں اس نوع کی ترقی اور پیش رفت کی وجہ سے معاشرے کے ہر فرد کی تمام ضروریات باآسانی پوری ہونگی۔اسی طرح زراعت جو کہ نجی ملکیت اور زمین کے ٹکڑیوں میں تقسیم ہونے کے باعث زیادہ سودمند نہیں ہے اس دباؤ سے آزاد ہو جائے گی۔سائنس وٹیکنالوجی کی بنیاد پر کی جانے والی اصلاحات عوام کی ضروریات پورا کرنے کی ضامن ہونگی۔یوں اشیاء اتنی وافر مقدار میں پیدا ہونگی کہ معاشرے کے ہر فرد کی تمام ضرورتوں یعنی مانگوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔طبقات کا وجود مٹ جائے گا۔یہ مخاصمانہ کیفیت غیر ضروری ہوگی اور نئے سماجی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

طبقات کا وجود محنت کی تقسیم کے نتیجے میں ہوا۔محنت کی تقسیم جو اس وقت موجود ہے مکمل طور پر ختم کی جائے گی۔صرف سائنس وٹیکنالوجی کے حامل کیمیائی و میکانکی آلات پیداوار صنعتی و زرعی پیداوار کو اس سطح تک بڑھانے کیلئے کافی نہیں جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔بلکہ ان آلات پیداوار کو

پوری طرح استعمال میں لانے میں عوام کی صلاحیت ترقی میں مزید اضافے کا باعث بنے گی۔ جس طرح 18 ویں صدی کے کسانوں' دستکاروں' ہنرمندوں اور مینوفیکچرز کی حالت صنعتی انقلاب کے باعث مکمل طور پر بدل گئی اسی طرح سماج میں اشتراکی طریقہ پیداوار ایک بالکل مختلف انسان کو جنم دے گا۔ موجودہ طبقات مٹ جائیں گے۔ غیر طبقاتی معاشرہ جنم لے گا اور معاشرے میں مشترکہ پیداواری عمل ترقی میں اضافے کا باعث ہوگا۔ پیداواری عمل میں جدت کیلئے نئے عوامل اور وسائل کی ضرورت ہوگی۔ مشترکہ پیداواری عمل محض چند افراد تک ہی نہیں محدود ہوگا جیسے آج کل بورژوا نظام میں ہے۔ جہاں آج ہر فرد انفرادی طور پر پیداوار کے کسی ایک شعبے تک محدود ہے۔ اسے محض ایک محدود عمل تک محدود کر کے اس کا استحصال کیا جاتا ہے وہ سارے پیداواری عمل میں محض اپنی کسی ایک صلاحیت کو فروغ دینے پر مجبور ہوتا ہے اور بعض اوقات ایک پیداواری شعبے کے محض کسی ایک حصے تک محدود ہوتا ہے۔ گویا صنعت سازی کا عمل سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کو کم سے کم مفید بناتا ہے۔

کمیونل (مشترکہ) منصوبہ بند صنعت و معیشت پورے معاشرے کے باہمی اشتراک سے چلتی ہے وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے اور پیداواری عمل کو ترقی دینے کی صلاحیت اور گنجائش کو بروئے کار لاتی ہے۔ محنت کی تقسیم (سرمایہ دارانہ نظام میں) ایک فرد کو کسان بناتی ہے تو دوسرے کو موچی۔ تیسرے کو صنعتی کارکن تو چوتھے کو سٹاک مارکیٹ آپریٹر اور یہ سارے افراد مشینوں کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم مکمل طور پر مٹ جائے گی۔ اس نظام کے تحت دی جانے والی تعلیم نوجوانوں کو جلد ہی اس قابل بنا دے گی کہ انہیں پیداوار کے تمام عمل پر مہارت ہو اور وہ ایک شعبے پر دسترس رکھنے کے بعد دوسرے شعبوں میں بھی مہارت حاصل کر کے معاشرے اور بنی نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں اور یوں وہ زندگی بھر ایک اکتا دینے والے پیشے یا کاروبار سے نجات حاصل کر سکیں گے جو کہ دراصل تقسیم محنت کے مروجہ نظام کی بدولت ہے جس نے ہر فرد کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کی بنیاد کمیونزم پر ہوگی ہر فرد کو ایک جیسے مواقع فراہم کرے گا کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مختلف شعبوں میں بروئے کار لائے۔ جب یہ عمل شروع ہوگا تو طبقات کا وجود لازمی طور پر مٹ جائے گا۔ یوں کمیونزم کی بنیاد پر استوار کیا جانے والا سماج طبقات کی باہمی کشمکش اور مقابلے کی دوڑ سے آزاد ہوگا اس طرح شہروں اور دیہاتوں میں پایا جانے والا فرق مٹ جائے گا۔ زراعت اور صنعت کو شہر

یا دیہات میں آباد عوام بلا تامل چلانے کے ماہر ہونگے۔ اشتراکی بنیادوں پر میل جول کے باعث ان کے درمیان دوریاں ختم ہو جائیں گی۔ کمیونسٹ بنیادوں پر قائم ہونے والا سماج جہاں ایک طرف طبقات کے وجود کا متحمل نہیں ہوسکتا دوسری طرف ایسا سماج وہ ذرائع بھی فراہم کرتا ہے جو طبقاتی تفریق کو ختم کر سکے۔ زرعی آبادی کی محض زمینوں سے جڑت اور صنعتی آبادی کی محض صنعتوں تک محدودیت ایک ایسی کیفیت ہے جس سے زراعت اور صنعت دونوں میں ترقی کا عمل رک جاتا ہے اور یوں یہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کی ترقی کے آگے ایک دیوار یا رکاوٹ بن جاتی ہے۔

عوام کے باہمی اشتراکی عمل کے نتیجے میں تمام افراد کا تعاون، پیداواری عمل میں مشترکہ منصوبہ بندی کے تحت شمولیت ہی پیداوار میں اضافے کا باعث بنے گی جس میں ہر فرد کی ضروریات احسن طریقے سے پوری ہونگی، بے یقینی اور بے چینی کی صورتحال کا قلع قمع ہو جائے گا۔ پراگندگی مٹ جائے گی اور موجودہ نظام جس میں چند افراد کی ضروریات پوری کرنے کیلئے اکثریتی عوام کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ طبقات بمعہ اپنے تضادات کے مٹ جائیں گے۔ موجودہ تقسیم محنت کے نظام کو ختم کرتے ہوئے عوام کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم ہونگے۔ صنعتی تفریق کا خاتمہ اور دوسری سرگرمیوں کے ذریعے عالمی ذرائع پیداوار میں عالمگیر بنیادوں پر شراکت اور استفادے، قصبوں اور ملکوں کے بندھنوں سے آزاد ہو کر نجی ملکیت کے منہدم ہونے کے دورس نتائج برآمد ہونگے۔

سوال- کمیونسٹ نظام کے خاندان پر کیا اثرات مرتب ہونگے؟

جواب- اس نظام میں افراد کے درمیان پروان چڑھنے والے رشتے حسد، لالچ اور منافقت سے پاک نوعیّتوں کے ہونگے جن کی بنیادیں حقیقی معنوں میں انسانی اقدار پر ہوں گی۔ مگر یہ نجی ملکیت کے خاتمہ سے ہی ممکن ہوگا۔ بچوں کو اشتراکی بنیادوں پر تعلیم دی جائے گی۔ شادی جو ایک سماجی معاہدے کی شکل ہے اپنے خاوند پر انحصار یا محتاجی، بچوں کا والدین پر اخراجات کا بوجھ اور ان کا اپنے والدین پر انحصار جو نجی ملکیتوں کی دین ہے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم کمیونسٹ سماج میں عورت کی مشترکہ ملکیت کے بارے میں جاہل بورژوا دانشوروں کی واعظانہ آہ و پکار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ عورت کی مشترکہ ملکیت ایک ایسی کیفیت ہے جس کا تمام تر تعلق بورژوا سماج سے ہے۔ جس میں

عورتوں کی حیثیت محض ایک جنس کی ہے۔اسے فحاشی کا اڈا' بازار حسن' عصمت فروشی اور طوائف کے مکروہ دھندوں پر مجبور کیا جاتا ہے۔عصمت فروشی دراصل نجی ملکیت پر بنیاد رکھتی ہے۔نجی ملکیت کے خاتمہ کے بعد کوئی عورت اپنی عزت کی نیلامی کی بھینٹ چڑھنے پر مجبور نہیں ہوگی۔سرمایہ دارانہ نظام کے منہدم ہونے کے بعد عورت جنسی بنیاد پر تفریق اور غلامی کے جبر سے آزاد ہو جائی گی۔وہ ایک حقیقی' پرمسرت' باعزت اور باوقار زندگی گزارے گی۔کمیونسٹ معاشرہ درحقیقت عورتوں کو مشترکہ ملکیت بنانے کی بجائے اس گھناؤنے تعصب کو ختم کرتا ہے۔

سوشلسٹ سماج میں خاندان ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت اور بنیادیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جہاں رشتوں سے مفاد پرستی' جذبوں سے خودغرضی اور ناطوں سے مجبوری اور محتاجی کا یکسر خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سوال-قوموں یا قومیتوں کے متعلق کمیونزم کا کیا رویہ ہوگا؟

جواب- قومیں اور قومیتیں عوام کے اتحاد کے تابع ہو جائینگی لوگ اس نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل جائیں گے کہ مذہب' رنگ' نسل' علاقہ یا وطن کی بنیاد پر تمام تر تعصّبات اور نفرتیں مٹ کر رہ جائیں گی۔قومی وقار اور ثقافت کے نام پر موجود گھناؤنے اور ماضی بعید کے ظالمانہ رسم و رواج ختم ہو جائینگے۔تمام ثقافتوں کے حسین پہلوؤں کو نکھار ملے گا۔تمام زبانوں کی ترقی اور ترویج کیلئے وسائل میسر آئیں گے۔قومی جبر واستحصال کا خاتمہ ہوگا۔تمام قوموں کی سوشلسٹ فیڈریشن میں شمولیت مکمل رضا کارانہ رائے' جہاں سرمائے اور ملکیت کی ہوس کا جبر نہ ہو' کے ذریعے ہوگا۔اس سے سوشلسٹ سماج مختلف رنگوں' نسلوں' زبانوں اور ثقافتوں کا ایک حسین گلدستہ بنے گا جس میں تعصّبات اور نفرتوں سے پاک معاشرہ لطیف جذبات اور احساسات کو جنم دے گا۔جہاں یہ سماج نسل انسان کی عظیم تر یکجہتی--انسانیت کو کہیں بلند اور خوشحال پیمانے پر حاصل کرنا ممکن بنا سکے گا۔اس نظام میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ طبقاتی تقسیم سمیت ہر نوع کی دوسری تقسیم کا مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے لوگ باہم مل جل کر رہتے ہیں۔مگر یہ تمام تر حاصلات نجی ملکیت کے خاتمے سے ہی ممکن ہیں۔

سوال- مارکسزم کیا ہے؟

جواب- کارل مارکس (1818-1883ء) کے نظریات کے مجموعے کو مارکس ازم کہا جاتا ہے۔ مارکس نے انیسویں صدی کے تین بڑے نظریاتی رجحانات کو آگے بڑھاتے ہوئے نقطہ عروج تک پہنچایا۔ کلاسیکی جرمن فلسفہ' برطانوی سیاسی معاشیات اور تاریخی مادیت۔ اس کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ مارکس کے انتہائی ہم آہنگ اور جامع نظریات ہی' بحیثیت مجموعی جدلیاتی مادیت اور سائنسی سوشلزم کی تشکیل کرتے ہیں اور دنیا بھر کے ممالک میں محنت کشوں کی تحریک کے نظریات اور پروگرام ہیں۔ یہی سوشلسٹ انقلاب اور کمیونسٹ معاشرے کے حصول کی بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال- مارکس ازم' لینن ازم' اور ٹراٹسکی ازم کیا ہیں؟

جواب- یہ اصطلاح عام طور پر انقلابی مارکسسٹوں کیلئے استعمال کی جاتی ہے (ایسے لوگ جو سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنا ضروری ہے) اس کے برعکس اصلاح پسند یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام کو رحم دل اور شریف النفس بنایا جا سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ لینن ازم حقیقتاً مارکس کے تصورات کے سامراجی عہد (یعنی مالیاتی سرمائے اور اجارہ داریوں کے غلبے اور نوآبادیاتی دنیا پر بڑی طاقتوں کے مکمل تسلط کا دور) تک توسیع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

لیکن مارکس ازم یا لینن ازم کے حوالے سے ابھی تک کچھ پراگندگی پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ سٹالن اور ماؤ کے جبکہ دوسرے لوگ ٹراٹسکی کے پیروکار ہیں۔ سٹالن اور ماؤ مارکسسٹ نہیں تھے بلکہ درحقیقت وہ مارکس ازم کے نظریات کے مسخ شدہ اور زوال پذیر رجحانات کی نمائندگی کرتے تھے کیونکہ ان کے نظام میں ریاست مزدوروں کے جمہوری کنٹرول کی بنیاد پر قائم نہیں تھی بلکہ بیوروکریٹوں کے آمرانہ غلبے کی بنیاد پر قائم تھی۔ جو مزدور ریاست کے بدن سے طفیل خوروں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

ٹراٹسکی ازم (جس نے 1924ء میں لینن کی وفات کے بعد سٹالن کی رجعتی پالیسیوں سے اختلاف کرنے والوں کی راہنمائی کی تھی) درحقیقت مارکس ازم اور لینن ازم کا ہی تسلسل ہے لیکن

بہت سے لوگ ٹراٹسکی ازم کی اصطلاح خود کو سٹالنسٹوں سے الگ کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے مارکسسٹ ٹراٹسکی ازم کو مارکس ازم اور لینن ازم کا تسلسل سمجھنے کے باوجود خود کو مارکسسٹ لیننسٹ کہلوانے پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ اس کے پیروکاروں میں سے بہت سوں نے ایسی جنونی اور الٹرالیفٹ پالیسیاں اپنائی ہیں کہ ان سے ٹراٹسکی ازم کا نام بدنام ہوا ہے۔ ٹراٹسکی نے مارکسسٹ نظریئے کیلئے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں سے دو انتہائی اہم ہیں۔ اول' سٹالن ازم کی نوعیت کا سائنسی تجزیہ اور دوئم' انقلاب مسلسل کا نظریہ جو نوآبادیاتی دنیا کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

سوال- جمہوریت اور سوشلزم بیک وقت کیسے وجود رکھ سکتے ہیں؟

جواب- اول تو یہ تصور ہی غلط ہے کہ مارکس ازم اور جمہوریت ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی مالیاتی آمریت (جسے عام طور پر 'جمہوریت' قرار دیا جاتا ہے) کے تحت حقیقی جمہوریت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں' چند سالوں بعد آپ صدارتی اور پارلیمانی انتخابات میں ووٹ ضرور ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمائیں کہ ان انتخابات میں حصہ کون لیتا ہے۔ صرف وہ لوگ جن کے پاس اس کام کیلئے وافر مقدار میں دولت موجود ہوتی ہے۔ ان کی انتخابی مہمات میں پیسہ کون لگاتا ہے؟ بڑی بڑی کارپوریشنیں اور سرمایہ دار۔ لہذا آپ کے پاس کوئی حقیقی متبادل نہیں ہوتا۔ عملاً یہ جمہوریت صرف امیر اور طاقتور لوگوں کیلئے ہے' یعنی بورژوا جمہوریت۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ منتخب ہونے والی حکومت کے پاس پالیسیوں پر عملدرآمد کے حوالے سے حقیقی معنوں میں زیادہ گنجائش موجود نہیں ہوتی۔ اگر امریکہ کے تین امیر ترین اشخاص کے پاس ساڑھے گیارہ کروڑ عام امریکی شہریوں کی اجتماعی دولت کے برابر دولت موجود ہوگی تو درحقیقت ملک کو بھی وہی چلائیں گے۔ اپنے معاشی فیصلوں کے ذریعے وہ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتے ہیں یعنی روزگار کے مواقع' علاج معالجے کی سہولیات اور تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ جب ان بڑی بڑی کارپوریشنوں کے مفادات کو خطرہ درپیش ہوتا ہے تو وہ انہیں بچانے کیلئے حکومت کو استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر جب 1973ء میں چلی میں سلواڈور ایاندے کی جمہوری

طور پر منتخب ہونیوالی حکومت نے تانبے کی کانوں اور ٹیلی کمیونیکیشن (جو امریکی کمپنیوں کی ملکیت تھیں) کو قومیانے کا فیصلہ کیا تو ان کمپنیوں نے کروڑوں ڈالر خرچ کر ڈالے اور پھر سی آئی اے نے چلی میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعے ایاندے کو قتل کروا کے وہاں کی جمہوری طور پر منتخب ہونے والی حکومت کی جگہ پنوشے کی وحشیانہ فوجی آمریت قائم کر دی۔ 2004ء میں ہونے والے امریکی صدارتی انتخابات میں 4 بڑی کمپنیوں نے بش کی انتخابی مہم میں 10.3 ملین ڈالر لگائے بش کے صدر بننے کے تین ماہ میں انکو ٹیکسوں میں چھوٹ کی مد میں 5 ارب ڈالر کا منافع حاصل ہوا۔ اس ایک مثال سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت دراصل کتنا بڑا منافع بخش اور مجرمانہ کاروبار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف سرمایہ دارانہ اجارہ داریوں میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ کیونکہ انہوں نے ریپبلیکن اور ڈیموکریٹک دونوں پارٹیوں میں کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی ہوتی ہے۔ آخری تجزیے میں حکومت اور سیاسی پارٹیاں بڑے سرمایہ داروں کے ہی اوزار ہیں اور وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کن پالیسیوں پر عمل درآمد ہوگا۔ ان پارٹیوں کا وجود خلاء میں نہیں ہوتا بلکہ ارب پتی سرمایہ داروں اور کارپوریشنوں نے ان میں براہ راست سرمایہ لگایا ہوتا ہے اور یہ انہیں کے زیر اثر ہوتی ہیں۔ لہذا یہ حقیقتاً 'قانون' 'سچائی' یا 'انصاف' کیلئے نہیں بلکہ ان سرمایہ داروں کے مفادات کیلئے کام کرتی ہیں جو ان کے منہ میں لقمے ڈالتے ہیں۔

اس کے برعکس سوشلسٹ انقلاب کے بعد دنیا کے معاشی وسائل نجی ملکیت میں نہیں بلکہ آبادی کی اکثریت کے ہاتھوں ہونگے جو ان کو جمہوری طریقے سے کنٹرول کریں گے اور چلائیں گے۔ یہ ایک حقیقی جمہوریت ہوگی جس میں لوگوں کو صحیح معنوں میں اپنی زندگیوں پر اختیار ہوگا۔ وہ جمہوری طریقے سے اپنے نمائندوں کو منتخب کر کے حکومت میں لائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان نمائندوں کو معیشت پر حقیقی اختیار بھی حاصل ہوگا اور وہ چیزوں کو حقیقی معنوں میں تبدیل بھی کر سکیں گے۔ اگر یہ اہل کاران کاموں کو احسن طریقے سے سرانجام نہیں دے سکیں گے' جن کے لئے ان کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا تو انہیں فوری طور پر واپس بھی بلایا جا سکے گا۔ اہل کاروں کو ایک ہنرمند مزدور کی اجرت سے زیادہ تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ان 'منتخب شدہ' اہل کاروں کی 'مراعات' ان کی تنخواہوں سے بھی تجاوز کر جائیں۔ مختلف امور کی انجام دہی کیلئے ایسے افراد سامنے آئیں گے جو واقعی وہ کام کرنا چاہتے ہوں گے' اس لئے نہیں کہ اس کی وجہ سے انہیں اضافی فوائد اور مراعات حاصل ہوں گی۔ یہ اہل کار معاشرے کے تمام اراکین میں سے منتخب ہوں گے۔ جیسا

کہ لینن نے کہا تھا 'کوئی باورچی بھی اس قابل ہوگا کہ وزیراعظم بن سکے'۔ یہ حقیقی معنوں میں عوام کی جمہوریت ہوگی۔

اس مسئلے میں ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہوچکی ہے کہ لوگ عام طور پر مارکسزم کو بھی اس نظام میں گڈمڈ کردیتے ہیں جو سوویت یونین میں قائم تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہاں جمہوریت جیسی کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ سوشلزم نہیں تھا۔ وہ سٹالن ازم تھا یعنی ایک ایسا نظام جس میں معیشت ریاست کے ہاتھ میں تھی لیکن شہری کسی بھی طور اسے چلانے میں حصہ دار نہیں تھے۔ نوکر شاہی نے ریاستی مشینری پر قبضہ کرلیا تھا اور اسے اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتی تھی۔ اس کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اقتدار میں آنے کیلئے سٹالن کو لاکھوں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کا خون کرنا پڑا تھا جن میں اس بالشویک پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اکثر اراکین بھی شامل تھے جنہوں نے 1917ء کے روسی انقلاب کی راہنمائی کی تھی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ حقیقی سوشلزم مارکسزم حتمی جمہوریت یعنی مزدوروں کی جمہوریت پر قائم ہے۔ وہ جمہوریت جو عوام کی اکثریت کے ذریعے عوام کی اکثریت کیلئے ہوتی ہے۔ ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ 'سوشلزم کیلئے مزدور جمہوریت اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کیلئے آکسیجن۔

سوال۔ سوشلزم کے تحت پیداوار کو سماجی کیسے بنایا جائے گا اور دولت کی تقسیم کس طرح کی جائے گی؟

جواب۔ جدید پیداوار کی نوعیت پہلے ہی سماجی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بھی تنہا آدمی تمام کی تمام کار یا سارا کمپیوٹر نہیں بنا سکتا۔ جدید معیشت اس قدر پیچیدہ ہے کہ کمپیوٹر جیسی چیز بنانے کیلئے دنیا بھر میں لاکھوں افراد کی کاوشوں کی ضرورت ہوتی ہے' خام مال مہیا کرنے والوں سے لیکر ہارڈ ویئر ڈیزائن کرنے والوں تک اور اسے اسمبل کرنے والوں سے لیکر آپ کے گھر کے دروازے تک پہنچانے والوں تک۔ یہ ایک اجتماعی عمل ہے۔ تاہم ان تمام محنت کشوں کی تخلیق کردہ دولت برابر تقسیم نہیں ہوتی۔ ارب پتی سرمایہ دار اور بڑی بڑی کارپوریشنیں اس کا بہت بڑا حصہ خود ہضم کر جاتی ہیں۔ یہ جدید محنت کش طبقہ ہی ہے جو روزمرہ بنیادوں پر فیکٹریاں اور کاروبار چلاتا ہے۔

محنت کش ہی اجتماعی طور پر سماج کی دولت کی تخلیق کرتے ہیں۔ تاہم انہیں اپنی کاوشوں کا حقیقی صلہ نہیں ملتا۔ یہ درست ہے کہ انہیں اجرتوں میں اضافے اور بونسوں کی شکل میں کچھ بچے کچے ٹکڑے مل جاتے ہیں لیکن سرمایہ دار خود جو 'بونس' کھاتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔ (مثال کے طور پر امیر صنعتی ممالک میں بڑی کارپوریشنوں کے عہدیداروں کو کئی کئی لاکھ ڈالر کرسمس کے تحفے کے طور پر ملنا معمول کی بات ہے)۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس دولت کو ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے جو درحقیقت اس دولت کو تخلیق کرتے ہیں۔

سوال- بیگانگی کیا ہے؟

جواب- سرمایہ داری نظام کی بیگانگی کی بنیادی وجہ محنت کش اور اس کی محنت سے تخلیق ہونے والی پیداوار کے درمیان لاتعلقی اور سرمایہ دارانہ استحصال پر پڑا ہوا پردہ ہے جو اجرتی محنت اور سرمائے کے درمیان حقیقی رشتوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ محنت کش جو پیداوار اور اس کی قدر تخلیق کرنے میں محنت صرف کرتا ہے اس کا صلہ اس کو نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہی ہاتھ سے بنائی ہوئی بہت سی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔ اس سے محنت اور پیداوار کے درمیان بیگانگی جنم لیتی ہے۔ جس کا شکار محنت کش طبقہ اور پورا معاشرہ شکار بنتا ہے۔ اس پوشیدہ استحصال سے اشیاء سے بے جا لگاؤ کا مرض جنم لیتا ہے جس کے باعث اشیاء جانداروں کی خصوصیات اپنا لیتی ہیں اور انسان کمتر ہو کر 'چیزوں' کی سطح تک آ جاتے ہیں۔ یہ مسخ شدہ اور پراسرار (بیگانہ) رشتے انسانی شعور کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور پھر یہ فطری اور ناگزیر سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس طرح انگریزی زبان میں محنت کشوں کو 'ہاتھ' کہا جاتا ہے اور ہم اکثر حوالہ دیتے ہیں کہ فلاں آدمی کی 'قدر و قیمت ایک ارب ڈالر ہے'۔ لیکن اس بیگانگی کی بنیاد پیداواری رشتوں یا قانونی زبان میں کہا جائے تو ملکیتی رشتوں پر قائم ہے۔

سوال- کسی عہد کے حاوی تصورات کیا ہوتے ہیں؟

جواب- ہر عہد کے غالب خیالات حکمرانوں کے خیالات ہوتے ہیں یعنی جو طبقہ سماج کی حکمران مادی قوت ہوتا ہے وہ حکمران فکری قوت بھی ہوتا ہے۔ وہ طبقہ جس کے قبضہ میں مادی پیداوار کے ذرائع ہوتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ ذہنی پیداوار کے ذرائع پر بھی قابض ہوتا ہے۔ لہذا عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی پیداوار کے ذرائع سے محروم لوگوں کے خیالات اس کے تابع ہو تے ہیں۔ حکمران خیالات غالب مادی رشتوں کے فکری اظہار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ خیالات تصور کئے جانے والے مادی رشتے اصل میں وہ رشتے ہیں جو کسی طبقے کو حکمران طبقہ بناتے ہیں۔ لہذا یہ خیالات اس کے غلبے کے خیالات ہوتے ہیں۔ حکمران طبقہ جن افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ دیگر چیزوں کے علاوہ شعور کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ دیگر چیزوں کے علاوہ مفکروں اور تصورات کے خالقوں کے طور پر بھی حکمرانی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے خیالات کی پیداوار اور تقسیم کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے خیالات عہد کے حکمران خیالات ہوتے ہیں۔

سوال- تاریخ میں فرد کا کردار کیا ہے؟

جواب- مارکس ازم تاریخ میں فرد کے کردار کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کرتا بلکہ محض یہ وضاحت کرتا ہے کہ افراد یا پارٹیوں کے کردار کا احاطہ تاریخی ارتقاء کی معینہ سطح اور معروضی اور سماجی ماحول کرتا ہے جو آخری تجزیہ میں پیداواری قوتوں کی ترقی سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے---- جیسا کہ مارکس ازم کے ناقدین کہتے ہیں---- کہ مردوزن محض معاشی جبریت کی اندھی کارگزاریوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں۔ مارکس اور اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ مردوزن اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن وہ ایسا مکمل طور پر آزاد عاملین کے طور پر نہیں کرتے بلکہ جس قسم کے سماج میں وہ موجود ہوتے ہیں اس کی بنیاد پر انہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ کسی دی گئی صورتحال میں سیاسی شخصیات کی ذاتی خصوصیات یعنی نظریاتی تیاری، مہارت، ہمت و جرات اور ثابت قدمی نتائج پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسے فیصلہ کن لمحات بھی آتے ہیں۔ جب قیادت کا معیار ایسا فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے جس سے صورتحال کا پانسہ پلٹ جائے۔ ایسے ادوار عام نہیں

ہوتے بلکہ یہ اسی وقت جنم لیتے ہیں جب ایسے طویل عرصے کے دوران پوشیدہ تضادات رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جدلیات کی زبان میں مقدار معیار میں بدل جاتی ہے۔ اگرچہ افراد محض اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر سماج کے ارتقاء کا تعین نہیں کر سکتے تاہم انسانی تاریخ میں داخلی عنصر کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔

سوال- سماج کی مادی بنیادیں کیا ہیں؟

جواب- جس طرح ڈارون نے نامیاتی فطرت کا قانون ارتقاء دریافت کیا تھا۔ اسی طرح مارکس نے انسانی تاریخ کا قانون ارتقاء دریافت کیا۔ اس نے یہ سادہ حقیقت دریافت کی' جو نظریاتی جھاڑ جھنکار تلے چھپ چکی تھی' کہ سیاست' سائنس' مذہب اور فن وغیرہ کی جستجو سے پہلے انسان کیلئے کھانا' پینا' کپڑے اور رہائش ملنا ضروری ہے۔ لہذا گزر بسر کیلئے درکار ضروری مادی ذرائع کی پیداوار اور اس کے نتیجے میں کسی عہد میں کسی قوم کی حاصل کردہ معاشی ترقی کی سطح وہ بنیاد ہے جس پر ریاستی ادارے' قانونی تصورات' فن اور یہاں تک کہ متعلقہ قوم کے مذہبی خیالات ارتقاء پاتے ہیں۔ لہذا اسی کی روشنی میں ان چیزوں کی وضاحت ہونی چاہیے نہ کہ اس سے الٹ جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔

سوال- سماجی ارتقاء کے قوانین کیا ہیں؟

جواب- سماجی پیداوار کے عمل کے دوران افراد ایسے مخصوص رشتوں میں بندھ جاتے ہیں جو ناگزیر ہوتے ہیں وہ ان کے ارادوں کے تابع نہیں ہوتے۔ یہ پیداواری رشتے پیداواری قوتوں کی ترقی کی مخصوص سطح سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ سماج کا معاشی ڈھانچہ انہی پیداواری رشتوں کے حاصل جمع پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر قانونی اور سیاسی بالائی ڈھانچے تعمیر ہوتے ہیں اور سماجی شعور کی مخصوص اقسام بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کا مروجہ طریقہ پیداوار کے سماجی' سیاسی اور روحانی عوامل کے عمومی کردار کا تعین کرتا ہے۔ مردوزن کا شعور ان کے وجود کا تعین نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی وجود ان کے شعور کا تعین کرتا ہے۔ ارتقاء کے

ایک مخصوص مرحلے پر یہ پیداواری رشتے سماج کی پیداواری قوتوں کے ارتقاء کی بجائے ان کے راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔اس کے بعد انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے۔معاشی تبدیلی آنے کے بعد سارا عظیم الشان بالائی ڈھانچہ بھی بالعموم بڑی تیزی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

ان تبدیلیوں کے حوالے سے جو فرق ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ معاشی حالات میں آنے والی مادی تبدیلی کا تعین فطری سائنس جیسی درستگی اور باریک بینی سے کیا جا سکتا ہے دوسری جانب قانونی' سیاسی' مذہبی' جمالیاتی یا فلسفیانہ نظریات وہ نظریاتی شکلیں یا ہیئتیں ہیں جن کے ذریعے انسان اس تصادم کے بارے میں شعور حاصل کرتے اور جدوجہد کرتے ہیں۔جس طرح ہم کسی فرد کے بارے میں رائے اس بنیاد پر قائم نہیں کرتے کہ اس کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔اسی طرح ہم تبدیلی کے کسی عہد کو اس شعور کی بنیاد پر نہیں پرکھتے۔اس کے برعکس اس شعور کی وضاحت مادی زندگی کے تضادات' پیداوار کی سماجی قوتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان موجود تصادم کی کیفیت کے ذریعے کی جانی چاہیے۔کوئی سماجی نظام اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ تمام پیداواری قوتیں ترقی نہیں پا جاتیں جن کیلئے اس میں گنجائش موجود ہے اور نئے اور اعلیٰ پیداواری رشتے اس وقت تک کبھی نمودار نہیں ہوتے جب تک ان کے وجود کے مادی حالات پرانے سماج کی کوکھ میں پختہ ہو کر تیار نہیں ہو جاتے۔

انسان ہمیشہ اپنے ان مسائل سے الجھتا ہے جنہیں وہ حل کر سکتا ہو کیونکہ اگر ہم معاملے کا بغور جائزہ لیں تو ہمیشہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسئلہ صرف اس وقت سر اٹھاتا ہے جب اس کے حل کیلئے درکار ضروری مادی حالات پہلے سے وجود رکھتے ہوں یا کم از کم تشکیل کے مرحلے میں ہوں۔ذرا وسعت میں دیکھیں تو ہم ایشیائی قدیم جاگیردارانہ اور جدید بورژوا طریقہ پیداوار کو سماج کی معاشی تشکیل کے ارتقاء کے مختلف ادوار کا نام دے سکتے ہیں۔بورژوا پیداواری رشتے پیداوار کے سماجی عمل کی آخری مخاصمانہ شکل ہیں' انفرادی مخاصمت کے مفہوم میں نہیں بلکہ ایسی مخاصمت جو سماج میں رہنے والے فرد کی زندگی کا احاطہ کرنے والے حالات سے جنم لیتی ہے جبکہ ساتھ ہی ساتھ بورژوا سماج کی کوکھ میں ارتقاء پانے والی پیداواری قوتیں اسی مخاصمت کو دور کرنے کیلئے درکار مادی حالات پیدا کرتی ہیں' لہذا یہ انسانی سماج کے قبل از تاریخی مرحلے کا آخری باب ہیں۔

سوال- سرمایہ دارانہ ارتکاز کا تاریخی رجحان کیا ہے؟

جواب- پیداکاروں کی بے دخلی بے رحمانہ اور تباہ کن غنڈہ گردی کے ذریعے سرانجام دی جاتی ہے اور یہ جذباتی محرکات انتہائی بدنام' غلیظ' گھٹیا اور قابل نفرت کمینگی پر مبنی ہوتے ہیں۔ دہقان اور دستکار کی خود کمائی ہوئی نجی ملکیت کی بنیاد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی خودمختاری اور انفرادی محنت کے حالات کے ملاپ پر قائم ہوتی ہے۔اس کی جگہ سرمایہ دار بہت سے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے۔ یہ بے دخلی بذات خود سرمایہ دارانہ پیداوار کے داخلی قانون سے وقوع پذیر ہوتی ہے' ایک سرمایہ دار ہمیشہ بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔اس مرکزیت یا مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھوں بہت سے سرمایہ داروں کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ عملی محنت کی امداد باہمی پر مبنی شکل' سائنس کا شعور' تکنیکی استعمال' زمین کی منظّم کاشت' آلات محنت کی ایسے حالات میں تبدیلی جو صرف مشترکہ طور پر استعمال ہو سکتے ہوں' تمام ذرائع پیداوار کو مشترکہ سماجی محنت کے ذرائع کے طور پر استعمال کر کے باکفایت بنانے' تمام اقوام کو عالمی منڈی کے جال میں گرفتار کرنے اور اس کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو بین الاقوامی کردار عطا کرنے کا کام بھی روزافزوں پیمانے پر فروغ پاتا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی مسلسل کم ہوتی ہوئی تعداد کے پہلو بہ پہلو' جو تبدیلی کے اس عمل میں تمام مراعات پر غاصبانہ قبضہ اور اجارہ داری قائم کر لیتی ہے' وسیع پیمانے پر اذیت' جبر' غلامی' تذلیل اور استحصال بڑھتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ محنت کش طبقے کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے' وہ متحد اور منظّم ہوتا ہے جس کی وجہ سرمایہ دارانہ پیداواری عمل کا اپنا میکانزم ہے۔سرمائے کی اجارہ داری جو اس طریقہ پیداوار کے ساتھ ساتھ اور اس کے تحت فروغ پائی اب اس کے راستے کی دیوار بن چکی ہے۔ ذرائع پیداوار کی مرکزیت اور محنت کا سماجی کردار بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سرمایہ دارانہ خول سے ان کی مطابقت ختم ہو جاتی ہے اور یہ خول ٹوٹ جاتا ہے۔سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کی موت کا وقت آن پہنچتا ہے۔ بے دخلی کرنے والے بے دخل کر دیے جاتے ہیں۔

سوال- گلوبلائزیشن کیا ہے؟

جواب- گلوبلائزیشن سے مراد مختلف ممالک کے درمیان معاشی تعلقات کا وہ پھیلاؤ ہے جس کے نتیجے میں ایک عالمی معیشت تخلیق ہوئی ہے۔جس نے ہر قومی معیشت کو دیگر معیشتوں کا محتاج بنا دیا ہے۔کوئی بھی ملک خود کفیل نہیں ہے۔سب کو دوسرے ممالک کے ساتھ پیداواری اشیاء کے تبادلے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ایک مربوط عالمی معیشت بذات خود کوئی منفی چیز نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر ایک ہم آہنگ عالمی منصوبہ بندی پر مبنی معیشت پروان چڑھ سکتی ہے۔ایک ایسے معاشی نظام کے تحت جس کی بنیاد سماجی انصاف اور ذرائع پیداوار (فیکٹریوں' ٹیکنالوجی' سرمایہ) کی اجتماعی ملکیت پر ہو۔یہ عالمی انسانیت کیلئے ایک زبردست پیش رفت کا باعث بن سکتی ہے۔لیکن سرمایہ دارانہ نظام ذرائع پیداور کی نجی ملکیت اور ہر انفرادی سرمایہ دار کی زیادہ سے زیادہ منافع کی ہوس کی بنیاد پر قائم ہے۔یہ چیز ترقی کو ناممکن بنا کر ایک ایسی صورتحال پیدا کر دیتی ہے جس میں مٹھی بھر لوگ بے حد وحساب دولت جمع کر لیتے ہیں جبکہ کرہ ارض پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت کا معیار زندگی کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

سوال- غربت اور عدم مساوات میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟

جواب- اس وقت کرہ ارض پر چھ ارب انسان موجود ہیں جبکہ دس ارب انسانوں کیلئے خوراک پیدا کی جا سکتی ہے۔تاہم بھوک' فاقہ کشی اور غربت وافلاس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔80 کروڑ افراد غذائی کمی کا شکار ہیں جبکہ دو ارب چالیس کروڑ افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔مائیکروسافٹ کمپنی کے تین اعلیٰ ترین عہدیداروں کے پاس اس قدر دولت موجود ہے جو امریکی حکومت کی طرف سے غربت کے خلاف جاری پروگراموں کیلئے مختص کردہ رقم سے زیادہ ہے۔مختلف معیشتوں کے درمیان اشیاء کا تبادلہ منصفانہ بنیادوں پر نہیں ہوتا۔مٹھی بھر ملٹی نیشنل کمپنیاں جو بے پناہ طاقت کی مالک ہیں زیادہ تر دولت پر قابض ہیں (کرہ ارض کی مجموعی داخلی پیداوار کا چالیس فیصد اور تجارت کا ستر فیصد) اور باقی دنیا پر اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے من مانی شرائط مسلط کرتی ہیں۔

عالمی معیشت کی تقسیم سے سبھی ممالک کو برابر کا فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک کو ترقی یافتہ ممالک اور عالمی اجارہ داریوں کے ہاتھ اپنا خام مال (تیل' معدنیات' زرعی اجناس) اور محنت انتہائی سستے داموں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔ اس عمل سے عدم مساوات کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی ہے۔ غریب ممالک ایسی پیداواری اشیاء کے تبادلے پر مجبور ہوتے ہیں جن کی تیاری میں زیادہ محنت صرف ہوئی ہوتی ہے (تکنیکی پسماندگی کی وجہ سے) جبکہ ان کے عوض وہ ترقی یافتہ ممالک اور سامراجی اجارہ داریوں سے ایسی اشیاء لیتے ہیں جو مہنگی ہوتی ہیں جبکہ ان کی تیاری بہت آسان ہوتی ہے (ذرائع پیداوار کی معیاری اور مقداری حوالے سے اعلیٰ سطحی کے باعث)۔ اس عمل میں کون کھوتا ہے اور کون پاتا ہے یہ بات بالکل واضح ہے۔ علاوہ ازیں عالمی معیشت مغربی طاقتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر نگیں ہے اور وہ اپنی مرضی کی قیمتیں' تجارتی قوانین اور معاشی پالیسیاں باقی دنیا پر مسلط کر سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر 1960ء میں ایک امریکی ٹریکٹر خریدنے کیلئے تنزانیہ کو کافی کے دو سو تھیلے دینا پڑتے تھے۔ تیس سال بعد ایک امریکی ٹریکٹر کی خریداری کیلئے تنزانیہ کو چھ سو سے زائد کافی کے تھیلے دینا پڑتے ہیں۔

سوال- ملٹی نیشنل کمپنیاں اتنی طاقتور کیوں ہیں؟

جواب- دنیا میں مٹھی بھر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ سرمایہ داری کے ارتقاء کا فطری نتیجہ ہے جو کہ زیادہ انفرادی منافع کی لالچ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسے حاصل کرنے کیلئے سرمایہ دار مجبور ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں' اپنی پیداوار میں اضافہ کریں' فروخت بڑھائیں' نئی منڈیاں تلاش کریں اور موجودہ منڈیوں کے استحصال میں اضافہ کریں اور سستی محنت اور سستے خام مال کے حصول کیلئے نئے ممالک میں سرمایہ کاری کریں وغیرہ وغیرہ۔

نتیجے کے طور پر دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوگئی ہے یعنی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی مٹھی بھر بڑی بڑی کارپوریشنوں کے پاس جنہوں نے دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ جب ان کیلئے محض معاشی ذرائع سے اپنی شرائط منوانا ممکن نہیں رہتا تو ملٹی نیشنل کمپنیاں سامراجی ممالک کے سیاسی اور فوجی اداروں (امریکہ' یورپ اور جاپان جیسی بڑی طاقتوں کی حکومتوں' پارلیمانی' قوانین اور افواج) کو اپنے مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتی ہیں۔

اکثر اوقات مفادات کو چھپانے کیلئے ''انسانیت کے مفادات'' کے دفاع کی آڑ میں مداخلت کرتی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم یوگوسلاویہ' افغانستان اور عراق وغیرہ میں اسی قسم کی 'انسانی بہبود کیلئے کی جانے والی بمباریوں' کے نمونے دیکھ چکے ہیں۔ جنہیں بذات خود بڑی طاقتوں نے تخلیق کیا تھا اور وہی ان پر غالب ہیں۔ (عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک' نیٹو' اقوام متحدہ وغیرہ)

گلوبلائزیشن اس نظام کی حقیقی نوعیت کو چھپانے کیلئے نقاب کا کام کرتی ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی تعریف کیلئے جس کا خاصہ بین الاقوامی سطح پر محنت کش طبقے اور دنیا بھر کی اقوام کا چند طاقتوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں استحصال ہے' سامراج سے بہتر کوئی اصطلاح نہیں۔

سوال- کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے خلاف لڑا جائے؟

جواب- یہ غیر مساویانہ تبادلہ جس نے غریب ممالک کو غربت اور افلاس کی دلدل میں دھکیل دیا ہے انہیں بڑی طاقتوں یا ان کے تخلیق کردہ مالیاتی اداروں (عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک وغیرہ) سے قرضے لینے پر مجبور بھی کرتا ہے جس سے وہ مکمل طور پر غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے قرضوں کی وجہ سے وہ قرضے دینے والے اداروں کی جانب سے ان پر مسلط کئے جانے والے معاشی منصوبوں اور بین الاقوامی تعلقات کو قبول کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے تمام ادارے سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ بڑی طاقتیں اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ان اداروں کو محض اسی وجہ سے رقوم فراہم کرتی ہیں کیونکہ ان اداروں پر انہی کا غلبہ ہے اور وہ ہی ان کی پالیسیوں کا تعین کرتی ہیں۔ ان اداروں کی اصلاح کرنا یا ان کو جمہوری بنانا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ اگر یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کیلئے سودمند نہ رہے تو وہ انہیں رقوم کی فراہمی بند کر کے نئے ادارے تخلیق کر لیں گے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت کی بنیاد ذرائع پیداوار پر ان کا قبضہ اور ملکیت ہے یعنی مشینری' فیکٹریوں' زمینوں اور سرمائے کی ملکیت۔ جب تک ان طفیل خوروں کو بے دخل کر کے ان کی دولت کو عوام کے جمہوری کنٹرول میں نہیں دیا جاتا موجودہ صورتحال کی اصلاح کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔

سوال- سیاٹل، پراگ، اورونیس وغیرہ میں مظاہروں کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب- عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کی جانب سے نام نہاد ''امداد'' حاصل کرنے والے ممالک پر جو پالیسیاں مسلط کی جاتی ہیں وہ وہی ہیں جو دنیا بھر کے سرمایہ دار اپنے منافعوں میں اضافے کیلئے کرتے ہیں یعنی ریاست کی جانب سے فراہم کی جانے والی تعلیم اور صحت عامہ کی سہولتوں پر حملہ، اجرتوں میں کمی، چھانٹیاں، پینشنوں اور دیگر مراعات میں کمی، لیبر قوانین میں اصلاحات، پبلک سیکٹر میں چلنے والی کمپنیوں کی نجکاری وغیرہ۔ غریب ترین ممالک میں ان پالیسیوں پر اور بھی زیادہ تیز رفتاری سے عمل درآمد ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں ان کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج وسیع ہوتی ہے۔ غربت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور دنیا بھر میں ماحول کی تباہی کا سلسلہ اور آگے بڑھتا ہے۔ یہ مظاہرے جن کی شروعات سیاٹل سے ہوئی تھی اور اب ہر اس شہر میں دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں عالمی مالیاتی فنڈ، عالمی بینک یا دیگر بین الاقوامی اداروں کے اجلاس منعقد ہو رہے ہوں۔ یہ درحقیقت نوجوانوں اور محنت کشوں کے بڑھتے ہوئے غم و غصے اور مزدور بین الاقوامیت کی غمازی کرتے ہیں۔

سوال- کیا ایک مختلف قسم کے سماج کا قیام ممکن ہے؟

جواب- دنیا بھر میں عالمی مالیاتی فنڈ اور دیگر سامراجی اداروں کے خلاف ہونے والے مظاہرے ان کی پالیسیوں کی عالمی مخالفت کی علامت ہیں۔ لیکن اگر ہم ان ناانصافیوں کا مکمل خاتمہ چاہتے ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی سطح پر ایک مستقل اور زبردست جدوجہد منظّم کی جائے جس میں مزدور تحریک بھی شامل ہو اور اس کے ذریعے سماج کی انقلابی تبدیلی روبہ عمل میں لائی جا سکے۔

یہ جدوجہد محض کسی ملٹی نیشنل کے خلاف احتجاج یا کسی ادارے (چاہے وہ عالمی مالیاتی فنڈ ہو یا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کی بندش کی کوشش تک محدود نہیں رہ سکتی۔ ہمارا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے

کہ سرمایہ داری کو بطور ایک نظام کے ختم کر دیا جائے۔ بینکوں اور بڑی اجارہ دار کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے' ملٹی نیشنل کمپنیوں کی جمع کردہ دولت کو قبضے میں لے کر عالمی معیشت کی منصوبہ بندی کے تحت استوار کیا جائے۔ جسے تمام محکوم عوام کی شرکت سے جمہوری انداز میں چلایا جائے تاکہ وہ چند لوگوں کے منافع کی ہوس پوری کرنے کے بجائے انسانوں کی اکثریت کی ضروریات پوری کر سکے۔ ایک حقیقی سوشلسٹ سماج (سوویت یونین میں ناکام ہونے والا مسخ شدہ نوکر شاہانہ نظام نہیں) ہی واحد متبادل ہے۔ یہ صرف ممکن ہی نہیں ضروری بھی ہے۔

یہ انقلابی تبدیلی صرف محنت کش طبقے (سماج کا سب سے بڑا طاقتور طبقہ جو پیداوار روک کر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت کا بھرم دنوں میں کھول سکتا ہے) کی سربراہی میں اٹھنے والی ایک ایسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہی ممکن ہے جس میں سماج کے وہ تمام حصے بھی شامل ہوں جو اس سرمایہ دارانہ جبر کا شکار ہو رہے ہیں۔

سوال- لوگوں کی اس سے کیا مراد ہوتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہیں؟

جواب- مارکسی اصطلاح میں' سوشلزم' سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کے درمیان ایک عبوری دور کے طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے نظام تک عبوری سفر' جس میں ہم حقیقی معنوں میں ''ہر کسی سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق' اور ہر کسی کو اس کی ضرورتوں کے مطابق'' کا رشتہ قائم کر سکیں۔ اس لئے حقیقی مارکسسٹ کو متبادل کے طور پر سوشلسٹ بھی کہا جا سکتا ہے' تاوقتیکہ ان کا ہدف سرمایہ دارانہ نظام کا انہدام اور حقیقی محنت کشوں کے کنٹرول پر مبنی جمہوری سوشلزم کی تعمیر ہو۔

سوال - کیا یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری سے لڑے بغیر کسی ایک ادارے یا فرد کے خلاف لڑا جائے؟

جواب- یہ غیر مساوی نظام جس نے غریب محنت کش کو غربت اور افلاس کی دلدل میں دھکیل دیا اور انہیں بڑی طاقتوں یا ان کے تخلیق کردہ اداروں کا مقروض کر دیا ہے جس سے وہ مکمل

طور پر غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے حالات کی وجہ سے وہ ان اداروں کی جانب سے ان پر مسلط کئے جانے والے منصوبوں اور قوانین کو قبول کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تمام ادارے سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ان اداروں کی اصلاح کرنا یا ان کو جمہوری بنانا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ اگر یہ ادارے سودمند نہ رہے تو ان کی جگہ نئے ادارے تخلیق کر لئے جائیں گے۔ حکمرانوں کی طاقت کی بنیاد ذرائع پیداوار پر ان کا قبضہ اور ملکیت ہے یعنی مشینری، فیکٹریوں، زمینوں اور سرمائے کی ملکیت۔ جب تک ان طفیل خوروں کو بے دخل کر کے ان کی دولت کو عوام کے جمہوری کنٹرول میں نہیں دیا جاتا موجودہ صورتحال کی اصلاح کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔

سوال- انقلاب کیا ہے؟

جواب- باقی تمام تاریخ کی طرح انقلاب کی تاریخ کو سب سے پہلے تو یہ بتانا چاہیے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ تاہم یہ بات انتہائی ناکافی ہے۔ بیان سے ہی یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ جو کچھ ہوا وہ اسی طرح کیوں ہوا کسی اور طرح کیوں نہیں ہوا۔ واقعات کو نہ تو مہم جوئی کا ایک سلسلہ خیال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں پہلے سے طے شدہ انجام یا سبق کی لڑی میں پروئے ہوئے دانے سمجھا جا سکتا ہے۔ انہیں لازمی طور پر اپنے قوانین کے تابع ہونا چاہیے۔

عوام کی تاریخی واقعات میں براہ راست مداخلت انقلاب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عام ادوار میں ریاست، چاہے وہ مطلق العنان ہو یا جمہوری، خود کو قوم سے بلند کر لیتی ہے اور تاریخ ایسے ماہرین بناتے ہیں جن کا یہ کام ہے۔ مثلاً بادشاہ، وزراء، بیوروکریٹ اور ممبران پارلیمنٹ۔ لیکن ایسے فیصلہ کن لمحات میں جب پرانا نظام عوام کیلئے قابل برداشت نہیں رہتا تو وہ تمام رکاوٹیں توڑتے ہوئے ان حضرات کو سیاسی اکھاڑے سے خارج کر دیتے ہیں۔ اپنے روایتی نمائندوں کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں اور اپنی براہ راست مداخلت کے ذریعے ایک نئے نظام کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ہم اخلاقیات پرستوں پر چھوڑتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم حقائق کو اسی طرح لیں گے جس طرح ارتقاء کا معروضی راستہ ہمیں مہیا کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک انقلاب کی تاریخ سب سے بڑھ کر عوام کے اپنے مقدر کو خود اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے تاریخ کے میدان میں پرزور مداخلت کی تاریخ ہے۔

سوال- انقلابی پارٹی کیا ہوتی ہے؟

جواب- ایک پارٹی محض ایک تنظیمی ہیئت' ایک نام' ایک جھنڈا' افراد کا مجموعہ یا مشینری نہیں ہوتی۔ کسی مارکسسٹ کیلئے ایک انقلابی پارٹی پہلے ایک پروگرام' طریقہ ہائے کار' تصورات اور روایت ہوتی ہے اور پھر کہیں دوسرے درجے پر ایک تنظیم اور ایک مشینری ہوتی ہے (اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی اہم ہوتی ہیں) تاکہ ان تصورات کو محنت کش طبقے کی وسیع تر پرتوں تک پہنچایا جا سکے۔ مارکسی پارٹی کیلئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے نظریہ اور پروگرام کی بنیاد بنائے جو پرولتاریہ (محنت کش طبقہ) کے مجموعی تاریخی تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انقلابی پارٹی کی تعمیر کے کام کا آغاز ہمیشہ کیڈروں کو جمع کرنے اور ان کی تعلیم اور تربیت کرنے سے ہوتا ہے جو پارٹی کی ساری زندگی کے دوران ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں۔ یہ مسئلے کا پہلا حصہ ہے لیکن صرف پہلا حصہ۔ دوسرا حصہ زیادہ پیچیدہ ہے: محنت کشوں کی اکثریت تک اپنا پروگرام اور تصورات کیسے پہنچائے جائیں۔

سوال- انقلابی پارٹی کیوں ضروری ہوتی ہے؟

جواب- کسی مارکسی رجحان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مزدور تحریک کے وسیع تجربہ کو عمومی اصولوں کی شکل دیتے ہوئے محنت کش طبقے کی اجتماعی یاداشت کا کام کرے۔ تحریک کے اندر ایک علیحدہ رجحان کے طور پر ہمارے وجود کا کوئی اور جواز نہیں ہوسکتا۔ اگر محنت کش طبقہ کو سماج تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو ایک ایسی پارٹی کی تعمیر کا وقت طلب کام انتہائی ضروری ہے۔ انقلابی مواقع غیر معینہ عرصے کیلئے نہیں ہوتے۔ اگر محنت کش طبقہ سماج کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو ناگزیر طور پر حکمران طبقہ اپنے نظام کے دفاع میں اسے کچل ڈالتا ہے۔ بدقسمتی سے محنت کش طبقے کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کی کوششوں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے مثال کے طور پر چلی میں 73-1972ء کے دوران ایک انقلابی پارٹی راتوں رات وجود میں نہیں آ سکتی تھی۔ یہی کیفیت ہمیں 69-1968ء میں پاکستان میں ملتی ہے۔ اسے شعوری طور پر تعمیر کرنا ضروری ہے اور اس کی تعمیر بین الاقوامی سطح پر مزدور تحریک کی جدوجہد اور پہلے سے موجود

تنظیموں' پارٹیوں اور یونینوں کے اندر کی جانی چاہیے۔ انقلابی پارٹی اور قیادت کی موجودگی طبقاتی جدوجہد کے نتیجے پر اسی طرح فیصلہ کن انداز میں اثر انداز ہوتی ہے جس طرح قوموں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں فوج اور جنرل سٹاف کا معیار فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جس طرح جنگ کے آغاز پر جنرل سٹاف کو فوری طور پر معرض وجود میں نہیں لایا جا سکتا اسی طرح انقلابی پارٹی کو بھی عین موقع پر تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سالوں اور دہائیوں تک منظّم طریقہ سے تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ ساری تاریخ اور بالخصوص بیسویں صدی کی تاریخ ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے۔ محنت کش طبقے کی شہید اور عظیم انقلابی روزا لکسمبرگ ہمیشہ اس بات پر زور دیتی تھی کہ عوام کی انقلابی پہل قدمی انقلاب کی قوت متحرکہ ہے۔ اور اس کی بات بلکہ درست ہے۔ انقلاب کے دوران عوام بہت تیزی سے سیکھتے ہیں۔ لیکن انقلابی کیفیت کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ سماج کو ایک مستقل ابھار کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی محنت کش طبقہ کو مستقل طور پر شدید سرگرمی کی کیفیت میں رکھا جا سکتا ہے۔ نہ تو تجربات کیلئے وقت ہوتا ہے اور نہ ہی محنت کشوں کے پاس ٹامک ٹوئیاں مار کر سیکھنے کا وقت ہوتا ہے۔ جب زندگی موت کا مسئلہ پیش ہو تو غلطیوں کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ عوام کی ''خودروٗ'' تحریک کو تنظیم' پروگرام' پیش منظر' حکمت عملی اور طریقہ کار یعنی ایک انقلابی پارٹی کے ساتھ جوڑا جائے جس کی باگ دوڑ تجربہ کار کیڈرز کے ہاتھ میں ہو۔ سرمایہ داری نظام خود بخود تباہ نہیں ہوگا اور اس کا ہر بحران ہمارے لئے دشواریاں لے کر آئے گا۔ صرف بین الاقوامی سطح پر محنت کشوں کی شعوری جدوجہد اور انقلابی قیادت کی تعمیر ہی سرمایہ داری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک سکتی ہے۔ اس لئے بلاشبہ کسی بغاوت کی نہیں بلکہ محنت کش طبقہ یعنی سماج کی اکثریت کی شعوری تحریک کی ضرورت ہے۔ ہم سب مختلف ہیں اور یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ سب لوگ راتوں رات خود کار طریقہ سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے اور صبح اٹھتے ہی مل کر انقلاب کر دیں گے۔ ہم سب مختلف اوقات پر مختلف واقعات سے سیکھتے ہیں۔ ایک انقلابی رجحان کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے سماج کو تبدیل کرنے کا فریضہ سرانجام دیا جا سکے۔

سوال- کمیونسٹ مینی فیسٹو نے سیاسی جدوجہد کے طریقہ ہائے کار کے بارے میں کیا بنیادی مارکسی اصول پیش کیا تھا؟

جواب- ''کمیونسٹ فوری مقاصد کے حصول کیلئے' محنت کش طبقے کے ہنگامی مفادات کے حصول کیلئے لڑتے ہیں لیکن حال کی تحریک میں وہ مستقبل کی تحریک کا خیال رکھتے ہیں اور اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

کمیونسٹ' مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں کے خلاف کوئی الگ پارٹی نہیں بناتے۔ بحیثیت مجموعی پرولتاری طبقے کے مفاد کے سوا ان کا کوئی مفاد نہیں۔ وہ اپنے جداگانہ فرقہ پرور اصول قائم نہیں کرتے' جس سے مزدور تحریک کو کوئی خاص شکل دی جائے اور کسی خاص سانچے میں ڈالا جائے۔ کمیونسٹوں کا امتیاز مزدور طبقے کی دوسری پارٹیوں سے صرف یہ ہے کہ (1) مختلف ملکوں کے مزدوروں کی قومی جدوجہد میں وہ بلا امتیاز قومیت پورے مزدور طبقے کے مشترک مفاد پر زور دیتے اور ان کو نمایاں کرتے ہیں۔ (2) بورژوا طبقے کے خلاف مزدور طبقے کی جدوجہد اپنی نشو ونما کے جن مرحلوں سے گزرتی ہے ان میں وہ ہر جگہ اور ہمیشہ بحیثیت مجموعی پوری تحریک کے مفاد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کمیونسٹوں کا فوری مقصد وہی ہے جو مزدوروں کی سب ہی دوسری پارٹیوں کا' یعنی یہ کہ مزدوروں کا ایک طبقہ بنے' بورژوا طبقے کا غلبہ ختم کیا جائے اور پرولتاریہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرے۔ کمیونزم کی امتیازی صفت عام طور پر ملکیت کو نہیں بلکہ بورژوا ملکیت کو مٹانا ہے۔ مزدوروں کا کوئی وطن نہیں۔ اور جو ان کے پاس ہے نہیں اسے ان سے کون چھین سکتا ہے۔

سوال- سوشلزم کے ناگزیر ہونے کے بارے میں مارکس کی کیا رائے تھی؟

جواب- مارکس سرمایہ دارانہ سماج کی سوشلسٹ سماج میں تبدیلی کے ناگزیر ہونے کا جو نتیجہ اخذ کرتا ہے وہ خالصتاً رائج الوقت سماج کے ارتقاء کے معاشی قانون کے تحت ہے۔ مارکس کی وفات کے بعد پچاس برسوں میں محنت کی سماجی شکل نے تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور ہزاروں روپ

اختیار کر کے اپنا اظہار بہت واضح طور پر کیا ہے۔ بڑے پیمانے کی پیداوار میں اضافہ' سنڈیکیٹ اور ٹرسٹوں کے ساتھ ساتھ مالیاتی سرمائے کی قوت اور وسعت میں جو بے پناہ اضافہ ہوا ہے وہ سوشلزم کے ناگزیر ظہور کیلئے کلیدی مادی بنیاد فراہم کرتا ہے۔اس تبدیلی کی فکری اور اخلاقی قوت محرکہ اور اسے عملی جامہ بنانے والا طبقہ پرولتاریہ جس کی تربیت بذات خود سرمایہ داری نے کی ہے۔سرمایہ دار طبقے کے خلاف محنت کش طبقے کی جدوجہد بہت سی شکلیں اختیار کرتی ہیں اس کا آغاز معاشی جدوجہد سے ہوتا ہے اور بالآخر سیاسی شکل اختیار کرتی ہے۔جس کا مقصد سیاسی اقتدار پر پرولتاریہ کی فتح ہوتا ہے۔ پیداوار کی سماجی شکل اختیار کر جانے سے لازمی طور پر ذرائع پیداوار سماج کی ملکیت بن جائیں گے یعنی ''بے دخل کرنے والوں کی بے دخلی عمل میں آئے گی۔''اس تبدیلی کے براہ راست نتیجے کے طور پر محنت کشوں کی پیداواری کارکردگی میں زبردست اضافہ ہوگا' اوقات کار کم ہو جائیں گے اور چھوٹے پیمانے کی صنعت کی باقیات کی پسماندہ اور بکھری ہوئی پیداوار کی جگہ اجتماعی اور بہتر محنت لے لے گی۔سرمایہ داری صنعت اور زراعت کے بندھن کو توڑتی ہے۔سوشلزم انتہائی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان بندھنوں کو ازسرنو استوار کرنے کیلئے نئے عناصر تیار کرتا ہے۔صنعت اور زراعت کے درمیان اجتماعی محنت کو یکجا کر کے اور سائنس کا شعوری اطلاق کر کے اتحاد قائم کرتا ہے اور انسانی آبادی کو ازسرنو تقسیم کرتا ہے۔(اس طرح وہ دیہی پسماندگی' علیحدگی اور بربریت کے ساتھ ساتھ بڑے شہروں میں عوام کی وسیع اکثریت کے غیر فطری اجتماع کا بھی خاتمہ کرتا ہے۔) موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی اعلیٰ ترین شکلوں نے ایک نئے قسم کے خاندان' عورت کی حیثیت اور نئی نسل کی پرورش کے حوالے سے نئے حالات پیدا کیے ہیں۔جدید سماج میں سرمایہ داری کے ہاتھوں عورتوں اور بچوں کی محنت کا استحصال اور خاندان کی ٹوٹ پھوٹ ناگزیر طور پر انتہائی خوفناک' تباہ کن اور مکروہ شکلیں اختیار کرتی ہے۔تاہم جدید صنعت پیداوار کے سماجی انداز میں منظم عمل میں خاندانی حلقے سے باہر عورتوں' نوجوانوں اور دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو جو اہم کردار سونپتی ہے اس سے جنسوں کے تعلق اور خاندان کی ایک اعلیٰ شکل کی ایک نئی معاشی بنیاد ضرور فراہم ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ خاندان کی ٹیوٹونک عیسائی ہیت کو حتمی اور کامل خیال کرنا اس قدر بے ہودہ بات ہے جتنی قدیم روم' قدیم یونان یا مشرقی ہیتوں کو جو کہ اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو تاریخی ارتقا کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔علاوہ ازیں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حقیقت میں اجتماعی طور پر محنت کرنے والوں کا گروہ ہر دو جنسوں اور ہر عمر کے افراد پر مشتمل

ہونے کے باعث مناسب حالات میں لازمی طور پر انسانی ترقی کا سرچشمہ بن جاتا ہے اگرچہ خودرو اور وحشیانہ سرمایہ دارانہ شکل میں جہاں محنت کش پیداوار کے عمل کی خاطر زندہ رہتا ہے نہ کہ پیداوار کا عمل محنت کش کیلئے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بدعنوانی اور غلامی کی بیماری کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

سوال- تاریخ کا مادی تصور کیا ہے؟ (لینن کی وضاحت)

جواب- پرانی مادہ پرستی غیر مکمل، غیر مستقل مزاج اور یک طرفہ ہے اور اس سماج کی سائنس کو مادی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور پھر ان پر اس سائنس کو از سر نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے چونکہ مادہ پرستی کے نقطہ نظر سے شعور کو ذات کا اظہار قرار دیا جاتا ہے نہ کہ اس سے الٹ۔ اس لئے جب ہم مادہ پرستی کے نقطہ کا اطلاق انسانوں کی سماجی زندگی پر کرتے ہیں یہ بات سامنے آتی ہے کہ سماجی شعور سماجی ہستی کا نتیجہ یا اظہار ہے۔ انسان فطرت کے ساتھ کس انداز سے نبرد آزما ہے یعنی پیداوار کا وہ عمل جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھتا ہے اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کے سماجی تعلقات کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں کس قسم کے ذہنی تصورات و افکار جنم لیتے ہیں۔ انسانی سماج اور اس کی تاریخ پر مادی نقطہ نظر کے بنیادی اصولوں کے اطلاق کو بہت جامع انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ:

''اپنی زندگیوں کی سماجی پیداوار کے دوران افراد ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رشتوں میں بندھ جاتے ہیں جو ناگزیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات کے تابع بھی نہیں ہوتے۔ یعنی وہ پیداواری رشتے جو مادی پیداواری قوتوں کی ترقی کی اس مخصوص سطح سے میل کھاتے ہیں''۔

''سماج کا معاشی ڈھانچہ انہی پیداواری رشتوں کے حاصل جمع پر مشتمل ہوتا ہے یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر ایک قانونی اور سیاسی بالائی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اور سماجی شعور کی مخصوص ہیئتیں بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کی پیداوار کا طریقہ ہی سماجی، سیاسی اور فکری زندگی کے عمل کا تعین کرتا ہے۔''

تاریخ کے مادی تصور کی دریافت کے باعث یا زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا جائے تو مادیت (فلسفیانہ مادیت) کے سماجی مظاہرے کے دائرے تک تسلسل کے ساتھ وسعت اختیار کر جانے کی وجہ سے پہلے سے رائج تاریخ سے متعلق تھیوریوں میں موجود دو بڑے نقائص کا خاتمہ ہو گیا۔ اول یہ

کہ وہ زیادہ سے زیادہ محض انسانوں کی تاریخی سرگرمیوں کے نظریاتی محرکات کا احاطہ کرتی تھیں لیکن ان محرکات کی بنیادوں کے سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کرتی تھیں، نہ ہی وہ سماجی رشتوں کے نظام کے ارتقاء میں کارفرما معروضی قوانین کا تعین کرتی تھیں اور نہ ہی وہ اس بات کو مدنظر رکھتی تھیں کہ ان رشتوں کا دارومدار اس امر پر ہوتا ہے کہ مادی پیداوار کی ترقی کی سطح کیا ہے۔ دوم، یہ ابتدائی تھیوریاں آبادی کی اکثریت پر مشتمل عوام کی سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کرتی تھیں۔ جب کے تاریخی مادیت کے ذریعے عوامی زندگی کے سماجی حالات اور ان میں تبدیلی کا سائنسی درست مطالعہ پہلی بار ممکن ہوا۔

مارکسزم سے پہلے کی سوشیالوجی اور تاریخ نویسی ادھر ادھر سے جمع کردہ خام حقائق کا مجموعہ اور تاریخی عمل کے انفرادی پہلوؤں کی منظرکشی سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔ مختلف رجحانات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کے بعد انہیں تاریخی عمل کے انفرادی پہلوؤں میں سرگرم عمل مختلف طبقات کی پیداوار اور حالات زندگی کی انتہائی درست تعریفوں میں لیا گیا۔ اسی مخصوص ''غالب'' تصور یا اس کی تشریح کے انتخاب کا جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا کہ تمام تصورات وافکار اور مختلف رجحانات پیداوار کی مادی قوتوں کے حالات سے جنم لیتے ہیں۔ یوں مارکس ازم نے سماجی اور معاشی نظاموں کے ظہور، عروج اور زوال کے عمل کے جامع مطالعہ کیلئے راستہ ہموار کر دیا۔ لوگ اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن لوگوں کے، عوام کی اکثریت کے متحرکات کا تعین کون سی چیز کرتی ہے یعنی انسانی سماجوں میں جاری ان تمام تصادموں کا حاصل جمع کیا ہے؟ انسان کی تمام تر تاریخی سرگرمی کی بنیاد بننے والے مادی زندگی کی پیداوار کے معروضی حالات وشرائط کیا ہیں؟ ان حالات کے ارتقاء کا قانون کیا ہے؟ مارکس نے ان تمام باتوں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے تاریخ کے سائنسی مطالعہ کا راستہ دکھایا جس کی روح سے تمام تر تنوع اور تضادات کے باوجود یہ ایک ہی عمل ہے اور مخصوص قوانین کے تابع ہے۔

سوال- مارکسزم کا فلسفہ (جدلیاتی مادیت) کیا ہے؟

جواب- جدلیات نہ تو فکشن ہے اور نہ ہی تصوف۔ اگر اسے زندگی کے عام مسائل تک محدود نہ رکھا جائے تو یہ ایک سائنس ہے جس کے ذریعے پیچیدہ اور طویل اعمال کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جدلیات اور رسمی منطق میں وہی رشتہ ہے جو بالائی اور زیریں ریاضیات میں ہوتا ہے۔

ارسطو کی عام قضیے کی منطق یوں شروع ہوتی ہے کہ الف برابر ہے الف کے۔ اس مفروضے کو بے شمار انسانی اعمال کیلئے قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں الف الف کے برابر نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں حرفوں کو محدث شیشے کے نیچے رکھ کر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا بات آسانی سے ثابت ہو جائے گی۔ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فقط ایک جیسی مقدار کا استعادہ ہیں۔ مثلاً ایک پونڈ چینی۔ اصل میں ایک پونڈ چینی ایک پونڈ نہیں ہوتی۔ ایک زیادہ عمدہ پیمانہ فرق کو واضح کر دے گا۔ یہ بھی درست ہے کہ تمام اجسام مداخلت کے بغیر اپنا حجم، وزن اور رنگ وغیرہ بدل دیتے ہیں۔ وہ خود میں برابر نہیں ہوتے۔ ایک سوفطائی کہے گا کہ ایک خاص لمحے میں ایک پونڈ چینی ایک پونڈ وزن کے برابر ہوتی ہے۔

اگر اس انتہائی مشکوک قضیے کی عملی قدر کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو پھر بھی یہ نظریاتی تنقید کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ مثلاً ہم لفظ ''لمحہ'' کو حقیقی طور پر کیسے تصور میں لا سکیں گے۔ اگر یہ وقت کا ایک لامتناہی عرصہ ہے تو پھر اس مدت میں وہ ''لمحہ'' ناگزیر طور پر تغیر کا مرہون منت ہوگا۔ یا پھر کیا ''لمحہ'' کوئی خالص ریاضیاتی تجرید ہے؟ یعنی وقت کا صفر۔ لیکن ہر شے وقت کے اندر موجود ہے۔ اور موجودگی بذات خود تبدیلی کا مداخلت کے بغیر ایک عمل ہے۔ نتیجے کے طور پر ہر وقت موجودگی کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ لہذا الف برابر الف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اپنے ہی برابر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ تبدیل نہ ہو لیکن اگر وہ تغیر پذیر نہیں ہوگی تو موجود بھی نہیں ہوگی۔

پہلی نظر میں یہ ''باریکیاں'' بے سود لگتی ہیں مگر حقیقت میں یہ فیصلہ کن اہمیت کی مالک ہوتی ہیں ایک طرف الف برابر الف کا قضیہ ہمارے تمام علم سے جدا ہونے کا نکتہ لگتا ہے مگر دوسری طرف یہ نکتہ ہمارے علم کی تمام غلطیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی غلطی کے بغیر الف برابر الف کے قضیے کو استعمال کیا جا سکتا ہے مگر بعض حدود کے اندر رہ کر جب زبردست کام کے دوران الف میں مقداری تبدیلیاں نہ ہونے کے برابر ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ الف برابر الف کے ہے۔ مثال کے طور پر اسی طریقے سے ایک پونڈ چینی فروخت کرنے اور خریدنے والے کے مابین لین دین طے ہوتا ہے اسی طرح سورج کا درجہ حرارت متعین کیا جاتا ہے کچھ عرصہ پہلے تک ڈالر کی قوت خرید کا تعین بھی یونہی ہوتا تھا۔ لیکن مقداری تبدیلیاں بعض حدود سے پرے معیاری تبدیلیوں میں بدل جاتی ہیں ایک پونڈ چینی پانی یا مٹی کے تیل سے مل کر ایک پونڈ چینی نہیں رہتی۔ جب ایک ڈالر صدر کی جیب میں ہوتا ہے تو وہ ایک

ڈالرنہیں رہتا۔کس نازک وقت پر مقدار معیار میں تبدیل ہوجاتی ہے اس لمحے کا تعین عمرانیات سمیت علوم کے تمام شعبوں کیلئے بے حد اہم اور مشکل کام ہے۔

ہر کاریگر جانتا ہے کہ وہ دو چیزیں ایک جیسی نہیں بنا سکتا۔پیتل کی سلاخ میں کچھ ردو بدل کر کے اس سے کون بنائی جاتی ہے یہ ردو بدل ایک حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔(اسے برداشت کہتے ہیں) اس برداشت کو مدنظر رکھتے ہوئے خیال کیا جاتا ہے کہ تمام کونیں ایک جیسی ہیں (یعنی الف برابر ہے الف کے) جب یہ ''برداشت'' بڑھ جاتی ہے تو مقدار معیار میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کون خراب ہوکر بے قیمت رہ جاتی ہے۔

ہماری سائنسی سوچ ہمارے عام عمل کا ایک حصہ ہوتی ہے جس میں تیکنیک بھی شامل ہے جہاں تک نظریات کا تعلق ہے اس کیلئے بھی ''برداشت'' کی ضرورت ہے جو الف برابر کے قضیے سے معرض وجود میں نہیں آتی بلکہ اس قضیے کی جدلیاتی منطق سے جنم لیتی ہے کہ ہر چیز ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔عقل عامہ کی خوبی اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ بتدریج ''برداشت'' سے آگے نکل جاتی ہے۔

سرمایہ داری' اخلاقیات' آزادی' مزدور ریاست جیسے نظریات کے ساتھ کوئی بیہودہ قسم کا خیال بھی گہری تجریدات کی طرح بندھا ہوتا ہے۔یعنی سرمایہ داری سرمایہ داری کے برابر ہے۔ اخلاقیات اخلاقیات کے برابر ہے وغیرہ۔لیکن جدلیاتی سوچ چیزوں کو ان کے مسلسل تغیر کے تناظر میں دیکھتی ہے اور مادی حالات میں ان تبدیلیوں کا تعین کرتی ہے جن کی حد سے ماورا الف الف نہیں رہتا۔ایک مزدور ریاست ریاست نہیں رہتی۔

بیہودہ خیال کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ حقیقت کو بے حرکت سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت ازلی حرکت پر مشتمل ہے۔جدلیاتی سوچ ممکن حد تک نظریات کو درستگی' جامعیت' لچک اور بہتر مواد مہیا کرتی ہے بلکہ ایک شادابی جو نظریات کو ایک حد تک عملی زندگی کے قریب لے آتی ہے۔عام سرمایہ داری نہیں بلکہ ترقی کے کسی خاص مرحلے کی سرمایہ داری' عام مزدور ریاست نہیں بلکہ سامراجی گردوپیش میں کسی پسماندہ ملک میں مزدور ریاست۔

جدلیاتی سوچ کا بیہودگی سے وہی رشتہ ہے جو چلتی تصویر کا ساکت تصویر سے ہوتا ہے۔چلتی تصویر ساکت تصویر کے خلاف نہیں جاتی بلکہ وہ حرکت کے اصول کے تحت ساکت تصویروں کو ایک تسلسل میں پرو دیتی ہے۔جدلیات سچ سے انکار نہیں کرتی بلکہ بہت سے سچ اس طرح جوڑ دیتی ہے

کہ ہم ازلی طور پر تغیر پذیر حقیقت کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہیگل اپنی کتاب ''منطق'' میں قوانین کا ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔ مثلاً مقدار کا معیار میں بدل جانا' تضادات کے ذریعے آگے بڑھنا' ہیت اور مواد کا تصادم' تسلسل میں مداخلت' امکان کا ناگزیریت میں تبدیل ہو جانا وغیرہ۔ نظریاتی سوچ کیلئے یہ سب کچھ اتنا ہی ضروری ہے جتنے قضیے ابتدائی کاموں کے لئے۔

ہیگل نے ڈارون اور مارکس سے پہلے لکھا تھا۔ انقلاب فرانس نے سوچ کو جو زبردست تحریک دی تھی اسکی بدولت ہیگل نے سائنس کی ترقی کو پیشگی دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک بڑے آدمی کی پیش بینی تھی مگر ہیگل نے اسے خیال پرستانہ کردار دے دیا اس نے خیالی سایوں کو حتمی حقیقت قرار دے ڈالا۔ لیکن مارکس نے کہا کہ یہ خیالی سائے مادی اجسام کی حرکت کا عکس ہیں۔

ہم اپنے جدلیاتی مادہ پرست سے کہتے ہیں کہ اس کی جڑیں نہ تو آسمان میں ہیں اور نہ ہی ہماری ''آزادانہ مرضی'' کی گہرائیوں میں ہیں بلکہ معروضی حقیقت یعنی فطرت میں ہیں۔ شعور لاشعور سے جنم لیتا ہے' نفسیات جسمانی علم سے' نامیاتی دنیا غیر نامیاتی سے' نظام شمسی ستاروں کے جھرمٹ یا بادلوں سے۔ ترقی کے اس زینے کے ہر قدم پر مقداری تبدیلیاں معیاروں میں بدلتی رہیں۔ ہماری سوچ بشمول جدلیاتی سوچ تغیر پذیر مادے کے مختلف رنگ اور روپ ہیں۔ اس نظام کے اندر خدا' شیطان' غیر فانی روح' قوانین کی ابدی قدروں اور اخلاقیات کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جدلیاتی سوچ فطرت کی جدلیات سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کردار مکمل طور پر مادی ہے۔

ڈارون ازم جو مختلف صنفوں کی مقدار سے معیار میں تبدیلی کی وضاحت کرتا ہے' نامیاتی مادے کی دنیا میں جدلیات کی بہت بڑی فتح تھی۔ دوسری بڑی دریافت کیمیاوی عناصر کے ایٹمی اوزان کا ٹیبل ہے۔ اس سے آگے کی دریافت ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جانا تھا۔

ان ہیئت کذائیوں کے ساتھ درجہ بندی کا سوال قریبی طور پر وابستہ ہے جو فطری اور سماجی سائنس میں برابر کی اہمیت رکھتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے سویڈش ماہر نباتات نے چیزوں کی عدم تبدیلی کے متعلق جو بات کی تھی اس میں پودوں کی خارجی خاصیتوں کے مطابق تشریح اور درجہ بندی کی گئی تھی۔ علم نباتات کا وہ طفلانہ زمانہ منطق کے طفلانہ زمانے سے مشابہ تھا۔ کیونکہ ہماری سوچ اسی طرح ترقی کرتی ہے جیسے دوسری زندہ چیزیں۔ عدم تبدیلی کا خیال اسی وقت فیصلہ کن انداز میں جڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے جب پودوں کے ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور یوں حقیقی سائنسی درجہ بندی کی بنیاد تیار کی جائے۔

مارکس جوڈارون سے امتیازی طور پر ایک باشعور جدلیات پسند تھا' اس نے انسانی سماجوں کی ان کی پیداواری طاقتوں کی روشنی میں سائنسی درجہ بندی دریافت کی تھی۔ اس نے ملکیت کے تعلقات کا ڈھانچہ بھی معلوم کیا جو معاشرے کی جراحی پر مشتمل تھا۔ ریاست اور سماجوں کی بیہودہ درجہ بندی کی جگہ مارکسزم نے لے لی جو جدلیاتی مادیت کی درجہ بندی ہے۔ مارکس کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہی مزدور ریاست کے نظریے اور اس کے زوال کے لمحے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں اور جیسا کہ فریب خوردہ جہالت اور بے خبری تصدیق کرے گی' اس میں کہیں بھی کوئی مابعد الطبعیاتی یا عالمانہ بات نہیں ہے۔ معاصر سائنسی سوچ میں جدلیاتی منطق حرکت کے قوانین کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے برعکس جدلیاتی مادیت کے خلاف جدوجہد ایک دور افتادہ ماضی' پیٹی بورژوازی کی قدامت پسندی' خود فریبی کے مارے ہوئے یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کا واویلا اور کسی بعد کی زندگی کی امید کرنے والوں کی ترجمانی کرتی ہے۔

سوال- طبقاتی جدوجہد کیا ہوتی ہے؟

جواب- ''سب کو پتہ ہے کہ کسی بھی سماج میں کچھ لوگوں کے مقاصد اور کاوشیں دوسرے لوگوں کے مقاصد اور کاوشوں سے متصادم ہوتے ہیں اور یہ کہ سماجی زندگی تضادات سے بھری پڑی ہے اور یہ کہ تاریخ سماجوں کے درمیان' اور سماجوں کے اندر ایک جدوجہد کو ظاہر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں انقلاب اور ردانقلاب' جنگ اور امن' جمود اور تیز رفتاری ترقی یا زوال کے دور بھی یکے بعد دیگرے آ رہے ہوتے ہیں۔ مارکس ازم اس سلسلے میں طبقاتی جدوجہد کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ بظاہر جو انتشار اور بھول بھلیاں نظر آ رہی ہوتی ہیں ان پر لاگو ہونے والے قوانین کو دریافت کرتا ہے۔ کسی ایک یا متعدد سماجوں کے اراکین کی مجموعی کاوشوں کے مطالعے سے ہماری رہنمائی ان کاوشوں کے نتیجے کی سائنسی تعریف تک ہو سکتی ہے اور یہ متصادم کاوشیں ان طبقات کے طرز زندگی اور حیثیت میں فرق سے جنم لیتی ہیں جن میں ہر سماج تقسیم ہوتا ہے۔

مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا تھا کہ ''تاریخ میں جتنے بھی سماج گزرے ہیں ان کی تاریخ طبقاتی جدوجہد سے عبارت ہے۔ (بعد ازاں اینگلز نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ماسوائے قدیم اشتراکی سماج کے) آقا اور غلام' جاگیردار اور مزارع' سرمایہ دار اور محنت کش

قصہ مختصر یہ کہ جابر اور محکوم مسلسل ایک دوسرے کے خلاف صف آراء رہے ہیں اور ایک ایسی جنگ میں مستقل طور پر مصروف رہے ہیں جو کبھی پوشیدہ ہوتی تھی اور کبھی کھلی اور اس جنگ کا نتیجہ ہر بار یا تو سماج کی مجموعی انقلابی تشکیل نو کی صورت میں برآمد ہوتا تھا یا متحارب طبقات کی باہمی تباہی کی شکل میں۔ جاگیرداری سماج کے کھنڈرات سے ابھرنے والا جدید بورژوا سماج بھی طبقاتی دشمنوں کو ختم نہیں کر سکا اس سے محض اتنا ہی ہو سکا کہ اس نے نئے طبقات کو جنم دیا ہے جبر کے نئے حالات پیدا کیے ہیں پرانی ہیئتوں کی جگہ جدوجہد کی نئی ہیئتوں کو دی ہے۔ ہمارے عہد یعنی سرمایہ داری کے عہد کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس نے طبقاتی دشمنیوں کو سادہ کر دیا ہے سوال بحیثیت مجموعی دو عظیم جارح گروہ میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے۔ دو عظیم طبقات کے بعد جو ایک دوسرے کے سامنے براہ راست صف آراء ہیں یعنی بورژوازی اور پرولتاریہ۔''

مارکس کے کمیونسٹ مینی فسٹو سے لیا گیا درج ذیل پیرا ظاہر کرتا ہے کہ مارکس نے جدید سماج میں ہر درمیانے طبقے کی حیثیت کے معروضی تجزیے کے حوالے سے کیا وضاحت کی تھی۔

'' آج سرمایہ دار طبقے کے سامنے جتنے بھی طبقات صف آراء ہیں ان میں پرولتاریہ ہی حقیقی معنوں میں انقلابی طبقہ ہے۔ باقی طبقات جدید صنعت کے مقابلے میں بوسیدہ ہو کر بالآخر غائب ہو جاتے ہیں۔ پرولتاریہ اس کی خصوصی اور ناگزیر پیداوار ہے۔ نچلا درمیانہ طبقہ' چھوٹی صنعت کا مالک ' دوکاندار' دستکار اور کسان' سب کے سب بورژوازی کے خلاف اس لئے لڑتے ہیں کہ وہ خود کو درمیانے طبقے کی جزیات کی حیثیت سے بچا سکیں لہذا وہ انقلابی نہیں بلکہ قدامت پرست ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ رجعتی ہیں کیونکہ وہ تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ اتفاق سے انقلابی بھی ہیں تو محض اپنے پرولتاریہ میں تبدیل ہو جانے کے خوف سے' لہذا وہ اپنے حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے مفادات کا دفاع کرتے ہیں وہ اپنا نقطہ نظر ترک کر کے اس کی جگہ پرولتاریہ کا نقطہ نظر اپنا لیتے ہیں۔''

بہت سی تاریخ سے متعلق تحریروں میں مارکس نے مادی نقطہ نظر سے تاریخ نویسی کی انتہائی شاندار اور گہری مثالیں دی ہیں۔ ہر انفرادی طبقے اور بعض اوقات کسی طبقے کے اندر موجود پرت یا گروہوں کی حیثیت کا تجزیہ کر کے واضح کیا ہے کہ کیوں اور کیسے'' ہر طبقاتی جدوجہد ایک سیاسی جدوجہد ہوتی ہے۔'' مذکورہ بالا اقتباس ایک نمونہ ہے کہ مارکس تاریخی ارتقاء کے نتیجے کا تعین کرنے کیلئے کس طرح ایک کے بعد دوسرے طبقے میں تبدیل ہونے کے دوران آنے والے عبوری

مراحل، ماضی سے مستقبل کی طرف اس کے سفر اور پیچیدہ سماجی رشتوں کے جال کا تجزیہ کرتا تھا۔
مارکس کا معاشی نظریہ اس تھیوری کی انتہائی جامع، گہری اور تفصیلی تصدیق اور اس کا اطلاق ہے۔

سوال- مطالعے کے سلسلے میں ٹراٹسکی کا نقطہ نظر کیا تھا؟

(29 مئی 1923ء)

جواب- ڈیئر کامریڈز!

آپ لوگوں نے شکایت کی ہے کہ آپ اپنی دلچسپی کی دس فیصد کتابیں بھی نہیں پڑھ پائے اور پوچھا ہے کہ اس کیلئے مناسب نظام الاوقات کیسے ترتیب دیا جائے۔ یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کیونکہ اس کا فیصلہ بالآخر ہر شخص نے اپنی مخصوص ضروریات اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خود کرنا ہوتا ہے۔ تاہم یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص کس حد تک موجودہ ادب کے سلسلے میں باخبر رہ سکتا ہے، خواہ وہ سائنسی ہو سیاسی ہو یا کوئی اور، اس کا دارومدار صرف وقت کی مناسب تقسیم پر ہی نہیں بلکہ اس فرد کی سابقہ تربیت پر بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک ''پارٹی یوتھ'' کی طرف آپ کے خصوصی حوالے کا تعلق ہے تو میں صرف یہ مشورہ دوں گا کہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور خود کو زیادہ نہ پھیلائیں، ایک موضوع کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف نہ بھاگیں اور کوئی دوسری کتاب اس وقت نہ شروع کریں جب تک آپ پہلی کتاب کو پڑھ کر غور وفکر کرنے کے بعد اس پر مکمل عبور حاصل نہ کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں خود نوجوان تھا تو میں بھی محسوس کرتا تھا کہ میرے پاس کافی وقت نہیں۔ یہاں تک کہ جب میں جیل میں تھا اس وقت بھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ دن بھر میں میں جو پڑھ پاتا ہوں وہ کافی نہیں ہے۔ معاشی شعبے کی طرح نظریاتی شعبے میں بھی سب سے زیادہ مشکل اور وقت طلب مرحلہ ابتدائی سرمائے کا ارتکاز ہوتا ہے۔ صرف علم کے بعض عناصر بالخصوص نظری مہارت (طریقہ کار) کے عناصر پر مکمل دسترس حاصل کر کے انہیں اپنی فکری سرگرمیوں کا لازمی جزو بنانے کے بعد ہی آپ نہ صرف اس شعبے کے ادب کو سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ شناسا ہیں بلکہ علم کے ان شعبوں کو بھی جو اس سے مختلف ہیں کیونکہ آخری تجزیے میں طریقہ کار ہمیشہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

بہتر ہے کہ ایک کتاب پڑھی جائے۔ بہتر ہے کہ ایک وقت میں چھوٹی سی بات پر عبور حاصل کیا جائے لیکن مکمل طور پر کیا جائے۔ صرف اسی طرح سے سمجھ بوجھ کی دماغی صلاحتیں خود کو فطری انداز میں فروغ دے سکتی ہیں۔ فکر بتدریج خود اعتمادی حاصل کرے گی اور پھلے پھولے گی۔ ان ابتدائی باتوں کو ذہن میں رکھ کر آپ باآسانی اپنے لئے ایک نظام الاوقات وضع کر سکیں گے۔ اور پھر ایک سے دوسری دلچسپی کی طرف عبور آپ کو ایک خاص قسم کا لطف دے گا۔

سوال- انقلاب مسلسل کیا ہے؟

جواب- نظریہ مسلسل انقلاب کی عملی بنیادیں تین کلیدی نکات پر مبنی ہیں۔
پسماندگی اور جدیدیت کے ادغام پر مبنی معاشروں کے حکمران اپنی تاریخی اور اقتصادی کمزوری کی وجہ سے ان معاشروں کو ترقی یافتہ اور جدید بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تاریخی طور پر سرمایہ دارانہ صنعتی انقلاب کے جو فرائض بورژوا طبقے نے مکمل کرنے تھے ان میں جدید قوم اور قومی ریاست کی تشکیل' جدید صنعتی معاشرے کے قیام کے لئے درکار بنیادی ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کی تعمیر' جاگیرداری کا خاتمہ اور زرعی انقلاب' پارلیمانی جمہوریت کی استواری اور مذہب کو ریاست سے الگ کیے جانا تھے۔ پاکستان اور دوسرے نوآبادیاتی ممالک کے حکمران 'آزادی' کے بعد ان میں سے کسی فریضے کی تکمیل نہیں کر سکے۔ اور بڑھتے ہوئے سامراجی تسلط میں اس نظام میں رہتے ہوئے کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان فرائض کو تکمیل کیلئے درکار وسائل (بھاری صنعت' بینک' سرمایہ وغیرہ) کو ریاستی تحویل میں لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح قومی جمہوری انقلاب کے فرائض کو مکمل کرنے کیلئے سوشلسٹ اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے اس انقلاب کا کردار مسلسل یا پیہم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں جس طبقے نے انقلاب کی قیادت کرنی ہے وہ تاریخی اعتبار سے انسانی سماج کا جدید ترین طبقہ یعنی صنعتی مزدور یا پرولتاریہ ہے اپنی قیادت میں وہ غریب کسانوں اور سماج کے دوسرے پچھڑے ہوئے طبقات اور پرتوں کو لے کر ہی سرمایہ داری کا سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے خاتمہ کرے گا اس انقلابی سرکشی میں مسلح ایک سوشلسٹ انقلاب کے برپا ہونے سے کسی معاشرے میں سوشلزم نہیں آجاتا۔ سوشلزم کا حتمی مقصد ایک طبقات سے پاک معاشرہ کا قیام ہے ایسا سماج جہاں تمام اشیائے صرف کی بہتات کے ساتھ مساوی اور اجتماعی فراہمی ہو ایک ملک اور خصوصاً ایک پسماندہ ملک میں موجود ثقافتی' صنعتی و فنی

معیار اس قابل نہیں ہوتا کہ ان سے سوشلزم کے بنیادی تقاضوں کا حصول ممکن ہو اس لئے اگر سوشلسٹ انقلاب ایک ملک میں برپا ہوتا ہے تو سوشلزم کے حصول کیلئے پہلے تمام خطے میں اور پھر عالمی طور پر سوشلسٹ انقلابات کے عمل کا پھیل جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

سوال- کیا سوویت یونین کے انہدام سے سوشلزم کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی ہے؟

جواب- آج سے 88 سال قبل (پرانے روسی کیلنڈر کے مطابق 26 اکتوبر اور جدید کیلنڈر کے مطابق 7 نومبر کو) جو انقلاب برپا ہوا تھا اس کے ذریعے تاریخ میں پہلی مرتبہ محنت کش طبقے کی اکثریت نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں براہ راست اقتدار پر قبضہ کر کے ایک محنت کش ریاست کو جنم دیا تھا۔اس انقلاب کی تیاری اور اس کو برپا کرنے میں بالشویک (RSDLP)(B) پارٹی نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔محنت کش طبقے کی ایک بھاری اکثریت نے سویٹوں (پنچائتوں) کے ایک نظام میں منظّم ہو کر اجتماعی طور پر اس انقلاب کو جنم دیا اور اقتدار پر قبضہ کیا۔تقریباً 5 یا 6 سال تک یہ انقلاب ان کلاسیکی بنیادوں پر قائم رہا جو اس کے بانیوں نے رکھیں تھیں۔لیکن 24-1923ء کے بعد اس کی زوال پذیری کا آغاز ہوا۔سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کی پیش گوئی بھی سب سے پہلے اس انقلاب کے قائدین لینن اور ٹراٹسکی نے کر دی تھی۔ لیکن آج سامراجی پراپیگنڈہ کی یلغار میں جن دو حقائق کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1- اس انقلاب کی بدولت (زوال پذیری کے باوجود) 50 سے 60 سال کے قلیل عرصے میں روس ایک پسماندہ نوآبادیاتی ملک سے بدل کر دنیا کی دوسری بڑی معیشت کیسے بن گیا تھا۔

2 -سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد روس اور دوسری سٹالنسٹ ریاستوں میں بحران اور انسانی سماج کی جو کیفیت ہے وہ پہلے سے بہتر ہے یا بدتر ہے۔

1917ء میں زار شاہی کے جبر میں ایک غریب پسماندہ روس میں اکتوبر انقلاب نے جو

بنیادی تبدیلی برپا کی تھی وہ منڈی پر مبنی معیشت (جہاں پیداوار کا مقصد سرمایہ دار کا حصول شرح منافع ہوتا ہے) سے تبدیل کر کے اس کو منصوبہ بند (سوشلسٹ) معیشت (جہاں پیداوار کا مقصد انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتا ہے) میں تبدیل کر دیا تھا۔ مقصد پیداوار کی اس بنیادی تبدیلی نے سابقہ سوویت یونین میں ترقی کی جس رفتار اور وسعت کو جنم دیا اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے خطے میں نہیں ملتی۔ 1990ء تک سوویت یونین اسٹیل، مشین ٹولز، ٹریکٹر، ٹرکوں، سیمنٹ، کوئلہ، گیس، تیل، ریلوے، بجلی سمیت 30 اہم اور بنیادی صنعتوں میں دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار کر رہا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد 25 سالوں میں مغربی ممالک کی نسبت روس نے 1975ء تک دوگنا ترقی کی۔ اس دور میں فی کس آمدن میں 160 فیصد اضافہ ہوا۔ سماجی خرچ کی مد میں 400 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ 5 کروڑ 60 لاکھ فلیٹ تعمیر کیے گئے۔ بنیادی اور ثانوی تعلیم پوری آبادی پر لازم تھی۔ شرح خواندگی 99 فیصد تک پہنچ گئی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنیشن، سائنس دان اور ماہرین روس میں پیدا ہوئے۔ کئی شعبوں مثلاً خلائی تکنیک میں سوویت یونین نے امریکہ کو پچھاڑ دیا تھا۔ مکانوں اور ذرائع آمدورفت کے کرائے دنیا میں سب سے کم تھے۔ غذائی اشیاء کی قیمتیں اتنی کم تھیں کہ تمام اخراجات کر کے تنخواہ کا 50 فیصد سے زائد حصہ روسی محنت کش کے پاس بچ جاتا تھا۔ تعلیم علاج اور دوسری بہتر اجتماعی سہولیات مفت تھیں۔ چند سالوں میں سالانہ ترقی اور شرح پیداوار میں اضافہ 28 سے 30 فیصد رہا۔ کسی ملک کی سرمایہ دارانہ معیشت اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے تک بیروزگاری ایک جرم تھا روزگار اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری ریاست کے پاس تھی۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار اور تاریخی حقائق ساری دنیا نے حالیہ تاریخ میں دیکھے ہیں۔ یہ سب کچھ ذرائع پیداوار کے ملکیت کے رشتوں کی تبدیلی، زمین اور بھاری صنعت معیشت اور تقسیم کے ڈھانچے قومیائے جانے، ذرائع مواصلات، معاشی تبادلے او ربیرونی تجارت پر مکمل ریاستی اجارہ داری کی بنیاد پر ہی ممکن ہو سکا۔ انسانی تاریخ نے اتنی تیز ترین ترقی کسی اور دور یا نظام میں نہیں دیکھی۔

آج تمام تر پراپیگنڈے میں ان حقائق سے عوام کو بری طرح بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری جانب جو اس ترقی کے صرف ایک رخ سے متاثر ہو کر روسی اور چینی افسر شاہی کے پیروکار بن گئے تھے وہ اتنی دیوہیکل ترقی کے باوجود سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور وہاں پر مروجہ نظام کی تباہی کے اسباب بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

سوویت یونین میں برپا ہونے والے بالشویک انقلاب کی زوال پذیری 1924ء کے بعد سے شروع ہوئی۔ اسکی بنیادیں انقلاب کے ساتھ ساتھ ہی جنم لینا شروع ہوئی تھیں۔ روس چونکہ 1917ء میں پہلے سے ہی صنعتی معاشی سماجی اور ثقافتی طور پر ایک پسماندہ ملک تھا اس لیے پہلی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں نے وہاں کی بدحالی میں مزید شدت پیدا کردی۔ جنگ کے دوران اور اسکے فوری بعد انقلابی جدوجہد اور فتح کے خوف سے روس پر 21 ممالک نے فوجی چڑھائی کردی۔ چونکہ روس میں بالشویک انقلاب کی بدولت سامراجی ممالک میں اسی قسم کے انقلاب کا خطرہ بڑھ گیا تھا اس لیے انہوں نے اس انقلاب کو آغاز میں ہی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن اس انقلاب کی قیادت کے پاس وہ نظریاتی اور تنظیمی صلاحیتیں موجود تھیں جن کی بدولت انہوں نے اس سامراجی جارحیت کو شکست دی تھی۔ اسکے دو بنیادی طریقے اپنائے گئے۔

1 -تقریباً ساڑھے تین لاکھ کی بدحال فوج کو انقلابی عمل کے ذریعے صرف 18 ماہ کی قلیل مدت میں دفاع اور جنگ کے کیسار (وزیر) ٹراٹسکی نے 30 لاکھ کی مضبوط سرخ فوج میں تبدیل کردیا۔ جس نے سامراجی یلغار کے خلاف مزاحمت کے ذریعے بہت سارے معرکوں میں سامراجی فوجوں اور انکے گماشتوں کو شکست دی اور انقلاب کے دفاع میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

2 - دوسرا طریقہ کار محنت کشوں کی بین الاقوامی یک جہتی کا طریقہ کار تھا۔ چونکہ روس میں جنم لینے والا انقلاب کسی قوم یا ملک کا انقلاب نہیں تھا اور محنت کشوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم (دوسری انٹرنیشنل کی بائیں بازو کی حزب اختلاف) کی قیادت میں طبقاتی بنیادوں پر برپا ہوا تھا اس لیے اسی عالمی تنظیم کے پلیٹ فارم سے لینن اور ٹراٹسکی نے دنیا بھر کے محنت کشوں سے اپیل کی کہ اپنے طبقے کے اس انقلاب کے دفاع کیلئے عالمی طور پر جدوجہد کی جائے۔ اس اپیل کے جواب میں نہ صرف امریکہ، برطانیہ فرانس اور دوسرے سامراجی ممالک کے محنت کشوں نے ہڑتالوں کے ذریعے حملہ آور فوجوں کی سپلائی بند کردی تھی بلکہ اس بالشویک تحریک کے نتیجے میں حملہ آور فوجوں کے بہت سے سپاہیوں نے جارحیت سے انکار کرتے ہوئے بغاوتیں کردی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بالشویکوں نے جس نظریئے کے تحت انقلاب برپا کیا تھا وہ کسی ایک ملک میں سوشلزم نہیں بلکہ عالمی انقلاب کی لڑی کی ایک کڑی کے طور پر تھا۔

جولائی 1918ء میں لینن نے امریکی مزدوروں کے نام ایک خط میں لکھا ''ہم اس وقت ایک محصور قلعے میں ہیں (اور اس وقت تک رہیں گے) جب تک بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب کی

قوتیں ہماری مدد کو نہ آئیں۔''

اسی سال نومبر میں لینن نے لکھا۔

''دنیا کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ ہم نے روسی انقلاب کو برپا کرنے میں کوئی مہم جوئی نہیں کی۔ بلکہ یہ ایک اہم ضرورت تھی کیونکہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ دنیا بھر میں سوشلسٹ انقلاب فتح یاب نہیں ہوتا تو برطانوی فرانسیسی اور امریکی سامراج روس میں پرولتاری انقلاب اور آزادی کا گلا گھونٹ دیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ بین الاقوامی انقلاب کے سہارے داؤ پر لگا دیا ہے۔ ہم مکمل فتح تک صرف دوسرے ممالک کے محنت کشوں کے ساتھ مل کر ہی پہنچ سکتے ہیں۔''

اس فوجی اور بین الاقوامی محنت کش طبقے کی امداد اور یکجہتی سے روس میں انقلاب تو ہو گیا تھا لیکن کئی دوسرے خصوصاً ترقی یافتہ یورپی ممالک جن میں جرمنی' اٹلی' فرانس' ہنگری اور برطانیہ شامل ہیں کے انقلابات کے فتح یاب نہ ہونے کی صورت میں روس میں محنت کش طبقے کا انقلاب علیحدگی اور بیگانگی کا شکار ہونا شروع ہو گیا۔ جرمنی میں اسی عرصے میں تین انقلابات برپا ہوئے۔ ان میں نومبر 1918ء جنوری 1919ء مارچ 1921ء اور اکتوبر 1923ء کی انقلابی کوششیں اور سرکشیاں شامل تھیں۔ 1922ء میں لینن نے تیسری انٹرنیشنل کی مرکزی مجلس عاملہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''برلن جرمنی کا دل ہے اور جرمنی یورپ کا دل ہے۔ اگر جرمن انقلاب کامیاب نہیں ہوتا تو ہمارے انقلاب کا تباہی سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ جرمن انقلاب کی فتح کیلئے ہمیں اگر روسی انقلاب قربان بھی کرنا پڑا تو ہم ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔''

بعد میں جنم لینے والی زوال پذیری نے لینن کے اس تجزیئے کو پوری طرح سچ ثابت کیا۔ بالشویک انقلاب بچ تو گیا لیکن خانہ جنگی' سامراجی جارحیت اور یورپی انقلاب کی ناکامی کی بدولت روس میں انقلاب کے تنہا رہ جانے سے زوال پذیری کے عمل پر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے۔

پسماندہ روس میں ان آفات نے قلت اور قحط کی صورتحال پیدا کر دی۔ بالشویک پارٹی کے سینکڑوں لیڈر محنت کش ریاست کا دفاع کرتے ہوئے سول جنگ میں مارے گئے۔ جن کی جگہ اقتدار کی ہوس رکھنے والے بہت سے مفاد پرست چور دروازے سے بالشویک پارٹی میں گھسنا شروع ہو گئے۔ قلت اور مانگ میں اضافے نے جو بدحالی پیدا کی اس سے سماجی خلفشار انقلاب کے

بعد بڑھنا شروع ہوگیا۔ اس کو روکنے کیلئے ریاستی اقدامات میں شدت آنا شروع ہوگئی۔ کیونکہ مانگ اور قلت ناگزیر طور پر ریاستی عناصر کو مضبوط کرتی ہے اور افسر شاہانہ (بیوروکریٹک) اقدامات کا جواز فراہم کرتی ہے۔ 1920ء تک صورتحال یہ تھی کہ قبل از جنگ (1913ء میں پہلی عالمی جنگ سے پیشتر) کی نسبت محنت کش طبقے کی تعداد صرف 43 فیصد رہ گئی تھی اس طرح پیداوار میں انقلاب کے بعد کی صورت حال میں پہلے کئی سال بڑھنے کی بجائے گرتی چلی گئی تھی۔ صنعتی پیداوار صرف 18 فیصد رہ گئی تھی۔ اسی طرح انقلاب کرنے والے محنت کش طبقے کے ہراول دستے کا بھاری حصہ انقلاب کے دفاع کی نذر ہوگیا۔ خانہ جنگی اور انقلاب کے خطرے کے پیش نظر بالشویکوں کو بعض اوقات بہت شدید اقدامات بھی کرنے پڑتے تھے۔ داخلی انتشار اور بیرونی جارحیت کے خلاف لینن اور ٹراٹسکی کو 1920ء میں وار کمیونزم (جنگی کمیونزم) کی پالیسی کو بھی لاگو کرنا پڑا۔ ان مشکلات میں ایسے اقدامات کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

ٹراٹسکی افسر شاہی کے ظہور کی ایک عام مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے: ''جب کسی بھی چیز کی قلت پیدا ہوتی ہے تو اس کے حصول کے لیے قطاریں لگ جاتی ہیں۔ جتنی زیادہ بدحالی ہوگی ان قطاروں میں اتنا ہی خلفشار ہوگا اس لیے ان کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک سپاہی کی ضرورت جنم لیتی ہے اگر گوشت کے حصول کیلئے ایسی قطاریں لگتی ہیں تو ان کو کنٹرول کرنے والا سپاہی اپنے لیے اچھا گوشت پہلے کٹوا کر رکھ لے گا۔ یہ عمل افسر شاہی کے جنم کی بنیاد بنتا ہے''۔

لیکن افسر شاہی کے جنم لینے کے عمل میں روس کی ثقافتی اور سماجی پسماندگی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں انقلابات نہ ہونے سے روس کو نہ صرف صنعتی و معاشی تنہائی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ قومی اور ثقافتی بیگانگی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسی عمل سے افسر شاہی کے جنم کا آغاز ہوا تھا۔ عظیم مارکسی استاد فریڈرک اینگلز نے انیسویں صدی میں لکھا تھا: ''کسی بھی سماج میں جہاں فن سائنس اور حکومت ایک اقلیت کی ملکیت ہوتے ہیں وہاں وہ اقلیت ان کو اپنے مفادات کے حصول کیلئے غلط استعمال کرے گی اور اپنی اس پوزیشن سے بددیانتی کرے گی جو کسی بھی حوالے سے اس کو ملی ہو۔ روس کی اس بڑھتی ہوئی افسر شاہی کی روش کو لینن نے اپنی کتاب ''بہتر کم مگر بہتر'' (Better Fewer But Better) میں اس طرح بیان کیا۔

''ہمارا ریاستی ڈھانچہ بوسیدگی کی حد تک قابل مذمت ہو چکا ہے۔ ہمیں اس میں پیدا ہونے

والی خامیوں کو دور کرنے کیلئے سنجیدہ اقدامات کرنے ہوں گے۔ان بیماریوں کی جڑیں ماضی سے نکل رہی ہیں۔وہ ماضی جس کو ہم اکھاڑ کر پھینک تو چکے ہیں لیکن اس پر قابو نہیں پا سکے ہیں۔''

اس حوالے سے افسر شاہانہ زوال پذیری کا عمل معروضی طور پر تو چل رہا تھا لیکن 1923ء کے بعد اس کو داخلی اور نامیاتی شکل ملنا شروع ہوئی۔ 1922ء میں سٹالن جنرل سیکرٹری بنا (اس سے پیشتر جنرل سیکرٹری کے عہدہ کا مطلب پارٹی کی سرگرمیوں کو مربوط کرنے والا ہوتا تھا۔(جب بالشویک پارٹی نے انقلاب کیا تھا تو اس کا جنرل سیکرٹری سویڈلوف (Sverdlov) تھا۔اس طرح اس عہدے میں بیوروکریٹک اور جبر کی روش اجتماعی قیادت کے اصول کی بنیاد پر نہیں تھی اور ریاستی اقتدار میں بڑھتی ہوئی بدعنوان قیادت جو زیادہ تر چور دروازے سے داخل ہو رہی تھی اس نے سٹالن کی قیادت میں اس بیوروکریٹک زوال پذیری کو شعوری شکل دینی شروع کر دی۔چند ایسی شخصیات جو انقلاب سے پیشتر بالشویک پارٹی کی دشمن تھیں اقتدار ملتے ہی چور دروازے سے گھس کر سٹالن کے اس عمل کے جاری کرتے ہی اس کی اہم مشیر بن گئیں۔ان میں مارٹی نوف (Marty Nov) یاروسلاوسکی (Yaro Slavasky) وائی شنسکی (Vyshinsky) شامل تھے۔ ان ''دانشوروں'' نے جو عارضی اقدامات مخصوص جنگ اور خلفشار کے عالم میں کئے گئے تھے ان کو مستقل شکل دے کر افسر شاہی کی بنیادیں استوار کرنا شروع کر دیں۔جوں جوں انکی اقتدار پر گرفت مضبوط ہونا شروع ہوئی انہوں نے پھر اس افسر شاہانہ زوال پذیری کو نظریاتی بنیادیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ان میں 26-1924ء کے دور میں ایسے نظریات کو پروان چڑھایا گیا جو مارکسزم کی روح اور اساس کے منافی تھے۔ان میں پہلا نظریہ انقلاب کے روس کی سرحدوں میں مقید ہو جانے اور دوسرے ملکوں میں نہ پھیل سکنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ نظریہ جو لینن کی جنوری 1924ء میں وفات کے بعد ''ایک ملک میں سوشلزم'' کا نظریہ تھا۔یہ نظریہ قومی تنگ نظری اور عالمی محنت کش طبقے کی بین الاقوامی تنظیم (تیسری انٹرنیشنل) پر روسی تنظیم کے ریاستی اقتدار کے بلبوتے پر حاوی ہونے اور بین الاقوامی محنت کشوں کے ڈسپلن اور کنٹرول سے باہر نکلنے کے لئے مرتب کیا گیا۔ کیونکہ اس نظریئے کے پوری طرح مسلط ہونے کے بغیر افسر شاہی پوری ''آزادی'' سے بدعنوانی اور جبر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس نظریئے کے تحت مارکسزم پر طبقاتی بین الاقوامیت کے برعکس ایک ملک میں سوشلزم کے نظریئے کی بدولت قومی تنگ نظری اور قوم پرستی کے جذبات اور نظریات حاوی ہونا شروع

ہو گئے ۔لینن اور بالشویکوں نے جب انقلاب بر پا کیا تھا تو وہ کسی ملک کے انقلاب سے زیادہ ایک طبقے کا انقلاب تھا جس کو عالمی سوشلسٹ انقلاب کے تسلسل اور عمل کا ایک حصہ سمجھا گیا تھا۔ مارکسزم نے قوم پرستی کی نفی کرتے ہوئے انسانیت کی نجات کو طبقاتی یکجہتی اور جدوجہد سے تعبیر کیا تھا۔اسی بنیاد کو آگے بڑھاتے ہوئے لینن اور بالشویکوں نے انقلاب کے ذریعے جس ریاست کو جنم دیا تھا اس کا نام (USSR) سوویت سوشلسٹ ریپبلکوں کی یونین رکھا گیا تھا۔جس کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی عمل کے پھیلاؤ سے پوری دنیا کا نام (USSR) ہو جائے گا۔انقلاب بر پا کرنے والی قیادت نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سٹالن اور اسکے بعد آنے والے بیوروکریٹ اس عبوری سوشلسٹ سماج کو ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے تحت اس کو ایک علیحدہ اور مستقل شکل دے دیں گے۔دوسرے الفاظ میں سٹالنزم کا مارکسزم سے سب سے بڑا نظریاتی انحراف ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی تھا۔سوویت یونین کے دفاع میں بالشویکوں نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں اور اس کو سامراجی یلغار سے جس پالیسی (عالمی طبقاتی جدوجہد) کے ذریعے بچایا تھا اس کا مقصد روس کے انقلاب کو مقید کرنا نہیں تھا اسی میں ہی روسی انقلاب کی بقاء اور نجات ممکن تھی۔مارچ 1918ء میں لینن نے لکھا'' عالمی سامراج ایک فتح یاب بڑھتے ہوئے سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ ہماری پسماندگی نے ہی ہمیں آگے دھکیل دیا ہے اگر دوسرے ممالک کے انقلابی سرکشی کرنے والے محنت کشوں کی عظیم حمایت نہ ملی تو ہم ناگزیر طور پر مٹ جائیں گے۔

(لینن تصانیف جلد Xv صفحہ نمبر 187)

مارچ 1919ء میں لینن نے اس سوچ کو پھر دہرایا'' ہم محض کسی ایک ریاست کی بجائے ریاستوں کے ایک مشترکہ نظام میں رہ رہے ہیں۔سوویت ریپبلک کے وجود کا سامراجی ریاستوں کے ساتھ ساتھ لمبے عرصے تک رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' آخر میں ایک کو دوسرے پر فتح مند ہونا پڑے گا''۔(لینن۔تصانیف جلد Xvl صفحہ نمبر 149)5 جولائی 1921ء کو پارٹی کانگریس کے اجلاس میں لینن بہت واضح تھا۔''ہمارے لیے یہ واضح تھا کہ عالمی انقلاب کی مدد کے بغیر پرولتاریہ انقلاب کی فتح ناممکن ہے۔انقلاب دوسرے پسماندہ ممالک میں اور کچھ زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں فوری طور پر یا جلد بر پا ہوگا ورنہ ہم مٹ جائیں گے۔اس نظریئے اور سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے سوویت نظام کو ہر حالت اور تمام قیمت ادا کر کے قائم رکھنے کی کوشش کی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہم صرف اپنے لئے کام نہیں کر رہے بلکہ ایک بین الاقوامی انقلاب کے لئے کام

کر رہے ہیں۔''

(لینن تصانیف جلد XvIII صفحہ نمبر 321)

اگر لینن کے ان نظریات کا موازنہ سٹالنسٹ افرشاہی کے پروگرام' نظریات اور لائحہ عمل سے کیا جائے تو ہمیں احساس ہوگا کہ وہ لینن کے تمام تر بت بنانے اور قصیدے گانے کے باوجود اس کے نظریات اور سوچ کے الٹ چل رہے تھے۔ ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے تحت ان کو مارکسزم کی بیشتر پالیسیوں سے انحراف کرنا پڑا مثلاً انہوں نے اس پالیسی کے تحت سامراج اور سوشلسٹ معیشت پر مبنی ملک کے ساتھ ساتھ رہنے کے عمل کو مستقل شکل دے دی۔قومی بنیادوں پر سوچنے والی افسرشاہی نے سامراج سے ملکی بنیادوں پر''امن برائے بقاء باہمی'' کی پالیسی کو مستقل شکل دے کر مذاکرات اور سمجھوتے کرنے شروع کر دیئے۔ ان بنیادوں پر جہاں سامراج روس میں معاشی تبدیلی کو واپس کرنے میں ناکام رہا وہاں معمولی رعایتوں کے عوض اس نے روسی افسرشاہی سے ترقی یافتہ اور مغربی ممالک میں انقلابات کو جنم دینے کے عمل کو رکوانے کا کام لیا۔اسی حوالے سے''مرحلہ وار'' انقلاب کا نظریہ'' ایک ملک میں سوشلزم'' کے نظریئے کا تسلسل تھا۔ سامراجی ممالک کے ساتھ مذاکرات اور سمجھوتے کرنے میں سٹالنسٹ افسرشاہی نے جو''رعایتیں'' دیں ان میں نوآبادیاتی ممالک میں انقلابات کو قومی جمہوری انقلاب یا عوامی جمہوری انقلاب کے مرحلے پر مقید کرنے کا مقصد ان ممالک میں سامراج کے استحصال کو قائم رکھنا تھا۔اس پالیسی کے نتیجے میں چین (1925-27) چلی' ہندوستان اور دوسرے کئی ممالک میں انقلابات کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

داخلی محاذ پر لینن نے ایک عبوری سوشلسٹ سماج (جو سوشلزم کی طرف بین الاقوامی انقلاب کے ذریعے ہی بڑھ سکتا تھا) کیلئے مندرجہ ذیل معروضات تشکیل دی تھیں۔

☆ عبوری ریاست کے ہر اہل کار کا عوام کی بنیادی پنچائتوں (سوویتوں) کے ذریعے منتخب ہونا۔ان پنچائتوں کے سامنے جواب دہ ہونا اور سوویتوں کا کسی اہل کار کو واپس بلانے کا حق ہونا۔

☆ ہر اہل کار کا بتدریج تبدیل ہونا جس کی بنیاد محنت کشوں کے زیادہ سے زیادہ حصوں کا اقتدار میں شراکت اختیار کرنا (لینن کے الفاظ میں ہر باورچی وزیراعظم اور ہر وزیراعظم باورچی بن سکتا ہے)۔

☆ کسی علیحدہ فوج اور ریاست کا نہ ہونا بلکہ انقلاب کے دفاع کے لئے محنت کش عوام مسلح

ہوں گے۔ دفاع کا زیادہ کام سپاہیوں کی سوویتوں کے ذمے ہونا۔

☆ کسی بھی ریاستی اہل کار کی اجرت اور تنخواہ ایک عام ہنرمند مزدور سے زیادہ نہ ہونا۔

یہ بنیادیں انقلاب کے برپا ہونے کے چند سال بعد تک خونریزی خانہ جنگی اور بدترین حالات کے باوجود قائم رہیں۔ انسانی سماج کی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ اور حقیقی جمہوری ڈھانچہ اور طریقہ کار نہیں دیکھا گیا۔ آج کے سامراجی پراپیگنڈے میں لینن اور بالشویکوں کو جس بدترین آمریت کے نظام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تاریخی حقائق نہ صرف اس کی نفی کرتے ہیں بلکہ آج کے مالیاتی سرمائے کی آمریت کی لونڈی جمہوریت کی جعل سازی کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔

لیکن سٹالنزم کے تحت انقلاب کی زوال پذیری کے عمل نے محنت کشوں کی جمہوریت کے اس نظام کو بھی برباد کرنا شروع کر دیا۔ اس جمہوری بنیاد کے خاتمے نے سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ ٹراٹسکی کے مطابق ''ایک منصوبہ بند (سوشلسٹ معیشت) کی مسلسل تیز ترقی اور ارتقا کے عمل میں محنت کشوں کا مکمل جمہوری کنٹرول اور انتظام اسی طرح ضروری ہے جس طرح انسانی جسم کے لیے آکسیجن ضروری ہوتی ہے'' روس کا انقلاب ایک دن ایک سال میں زوال پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ یہ 1923ء سے شروع ہو کر 1938ء تک کے عرصے پر محیط تھا۔ اس زوال پذیری کے خلاف سب سے پہلی آواز لینن نے اٹھائی تھی۔ لینن کی موت کے بعد اس جدوجہد کو ٹراٹسکی نے جاری رکھا۔

لیکن انسانی تاریخ بے پناہ المیوں کی داستان بھی ہے۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ لینن اور ٹراٹسکی اور ان بالشویکوں کو عوامی حمایت کیوں نہیں مل سکی جو انقلاب کی زوال پذیری کے خلاف برسرپیکار تھے؟ دوسرے یہ کہ اگر سٹالن کی جگہ ٹراٹسکی سوویت یونین میں اقتدار پر قبضہ کر لیتا تو کیا پھر بھی زوال پذیری ناگزیر تھی یا نہیں؟

اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے ذریعے جنم لینے والی تبدیلیوں کے ثمرات روس کے سماج کو 1923ء کے بعد ملنے شروع ہوئے۔ مثلاً 1913ء کے معیار پر سماجی اور صنعتی ترقی 1923ء میں جا کر پہنچی تھی۔ جبکہ 1917ء کے بعد پر انتشار حالات کی وجہ سے انقلاب کے فوری بعد کے دور میں معیار زندگی گرتا چلا گیا تھا۔ لیکن معیشت کو سنبھالا صرف اسی وقت ملا جب سیاسی زوال پذیری شروع ہو چکی تھی اور افسر شاہی شروع ہو چکی تھی اور افسر شاہی مزدور جمہوریت کو ختم کر کے اپنا تسلط

مضبوط تر کر رہی تھی لیکن یہی وہ وقت تھا کہ روس کے عوام الناس کا معیار زندگی ایک سیاسی انقلاب کے ذریعے تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا۔ جنگوں' انقلابات اور انقلابات کے طوفانوں اور انتشار سے نکلنے والے روسی محنت کشوں کے وسیع حصے بری طرح تھک چکے تھے۔ بڑھتے ہوئے معیار زندگی میں ان کو بڑے عرصے بعد آسائش نصیب ہوئی تھی وہ پھر ایک نئی لڑائی لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ٹراٹسکی اور بائیں بازو کی حزب اختلاف کا ساتھ نہیں دیا جن کو انقلاب کی زوال پذیری کو بچانے کے لیے سٹالنسٹ افسر شاہی کے خلاف ایک نئی سیاسی اور سماجی جنگ کرنی پڑ رہی تھی۔ المیہ یہ تھا کہ جس اکتوبر انقلاب نے روس کے عوام کے معیار زندگی کو تیزی سے بڑھانا شروع کیا تھا اسی انقلاب نے لینن کے ساتھ قائد اور تخلیق کار ٹراٹسکی کی عوامی حمایت کو کمزور کرنے میں اسی بڑھتے ہوئے معیار زندگی نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

دوسری جانب یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر سٹالن کی جگہ ٹراٹسکی برسر اقتدار ہوتا تو انقلاب زوال پذیر نہ ہوتا لیکن تاریخ میں فرد کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ اگر لینن او رٹراٹسکی نہ ہوتے تو شاید انقلاب برپا نہ ہوتا۔ لیکن سٹالن نے اس زوال پذیری کے معروضی عمل کو شعوری اور داخلی شکل دی۔ کم از کم ٹراٹسکی کی قیادت میں یہ نہیں ہونا تھا۔ لیکن پھر آخری تجزیئے میں معروضی حالات فیصلہ کن اثر رکھتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کے ان عوامل میں کوئی حتمی فیصلہ یا رائے نہیں دی جا سکتی' کیونکہ ایک سے کہیں زیادہ عناصر ایسے تھے جن کی بدولت انقلاب زوال پذیر ہوا۔

اس زوال پذیری کو مکمل کرنے کے لیے جہاں سٹالنسٹ افسر شاہی نے شعوری یا لاشعوری طور پر بے پناہ سیاسی غلطیاں اور جرائم کیے۔ (جرمنی' فرانس' چین' برطانیہ وغیرہ) وہاں انہوں نے بالشویک لیننسٹ حزب مخالف کو بری طرح کچلنے کی بھی کوشش کی۔ اس جنگ میں 13 لاکھ کے قریب بالشویکوں اور انقلاب کی سیاسی زوال پذیری کے خلاف جدوجہد کرنے والے افراد اور انکے خاندانوں کا قتل عام ہوا۔ جس پارٹی (بالشویک پارٹی) کی قیادت میں اکتوبر کا انقلاب برپا ہوا تھا اس کی مرکزی کمیٹی کے 24 میں سے 23 ممبران 1938ء تک یا تو قتل کر دیئے گئے تھے یا خانہ جنگی میں شہید ہوئے تھے یا جیلوں اور سائبیریا کے کیمپوں میں پابند سلاسل تھے یا پھر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ روس میں صرف ایک ممبر باقی رہ گیا تھا۔ وہ سٹالن بذات خود تھا۔

لیکن سٹالنزم اور افسر شاہی کی حکمرانی کو 5 سے 7 دھائیوں تک طول نصیب ہوا وہ بنیادی طور پر اکتوبر انقلاب کی معاشی تبدیلی کی مرہون منت تھا۔ سٹالنزم بنیادی طور پر اکتوبر انقلاب کے خلاف

سیاسی ردانقلاب تھا۔ جبکہ معاشی بنیادیں وہی رہی تھیں جن کو سرمایہ داری' جاگیرداری اور سامراجی تسلط کا خاتمہ کر کے سوشلسٹ منصوبہ بندی پر استوار کیا تھا۔ اس معاشی نظام نے ان 65 سالوں میں سرمایہ داری کی منڈی کی معیشت کے نظام میں اپنی برتری تیل' سٹیل' سیمنٹ' عمارات' ٹریکٹروں' خلائی ٹیکنالوجی اور بے پناہ سماجی ترقی کی شکل میں ثابت کی۔ سٹالنسٹ افسر شاہی نے اس ترقی کے بلبوتے پر کئی نسلوں تک حکمرانی کی۔ لیکن مارکسزم لینن ازم سے انحراف اور غداری کی بدولت افسر شاہی نے سوشلزم کو نظریاتی اور عملی طور پر جس طرح مسخ کیا تھا اس بنیاد پر وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی تھی۔ ان بنیادوں پر سٹالنزم کا لمبے عرصے تک برقرار رہنا ناممکن تھا۔

جوں جوں منصوبہ بند معیشت صنعتی اور تیکنیکی ترقی تیز کرتی گئی اسی سے معیشت کی وسعت بھی بڑھتی گئی۔ لیکن اس معیشت کی وسعت سے افسر شاہی کے حجم میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مزدور جمہوریت اور کنٹرول وانتظام کے فقدان کی وجہ سے اس افسر شاہی کی آمریت نے اس معیشت پر بوجھ بننا شروع کر دیا۔ 1970ء کی دہائی میں روس کی صنعت اور معیشت 10 لاکھ سے زائد اشیاء بنا رہی تھی۔ لیکن اسکی منصوبہ بندی 28 کروڑ آبادی کے ملک جو دنیا کی خشک سطح کے 1/6 حصے پر محیط تھا۔ صرف ماسکو میں قائم 50 وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ جس سے بدانتظامی اور پیدا ہونے والی اشیاء کے معیار میں تیزی سے گراوٹ آ رہی تھی۔ دوسری طرف منڈی اور منافع کے لالچ سے پاک سماج میں پیداوار کی انتہا ہو رہی تھی لیکن بدانتظامی کی وجہ سے اس پیداوار کے بڑے حصوں کا ضیاع ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ افسر شاہی نے اپنی عیاشیوں اور بدعنوانی کی انتہا کر دی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر جبر اور آمریت کے دور میں ناگزیر طور پر بدعنوانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح افسر شاہی کی بدعنوانیوں' بدانتظامی' ضیاع اور اس کے اپنے وجود کے بوجھ سے منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کا دم گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ 1970ء کی دہائی تک آتے آتے افسر شاہی 2 کروڑ 50 لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل ہو چکی تھی۔ مزدور جمہوریت کے فقدان نے آخر کار ایک سوشلسٹ معیشت کے ارتقاء کے عمل میں رکاوٹ بننا شروع کر دیا۔ لیکن ان داخلی پالیسیوں کا تسلسل افسر شاہی کی خارجہ پالیسیاں بھی تھیں۔ امریکی سامراج اور روسی افسر شاہی کے درمیان تضادات اور سرد جنگ کی اصل وجہ دونوں حکمران ٹولوں کی متضاد معاشی بنیادیں تھیں۔ لیکن ''ایک ملک میں سوشلزم'' کے سٹالنسٹ نظریئے کے تحت سامراجی ممالک میں انقلابی عمل کو تیز کرنے کی بجائے ایک طرف سامراج سے سمجھوتے ہوتے رہے جبکہ دوسری جانب بیرونی خطرے کے خلاف

بے پناہ وسائل اسلحہ سازی اور دفاع پر خرچ ہونا تھا۔ مجموعی قومی آمدن و پیداوار کا 60 فیصد بلواسطہ یا بلاواسطہ ان شعبوں پر خرچ ہوتا رہا۔ دوسری جانب اسی ''امن برائے بقائے باہمی'' کی پالیسی کی وجہ سے 1930ء کی دہائی اور بعداز جنگ سامراجی ممالک میں ابھرنے والے محنت کشوں کے انقلابات سٹالنسٹ اور سوشل ڈیموکریٹک روایتی قیادتوں کی غلط پالیسیوں کی بدولت ناکام ہوئے اور سرمایہ دارانہ نظام کو پھر زندہ کرنے کا موقعہ مل سکا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران 1943ء میں یالٹا میں ہونے والے معاہدے میں سٹالن چرچل اور روز ویلٹ جومغربی اور مشرقی یورپ کی بندر بانٹ کے اس معاہدے کے تحت فرانس، اٹلی اور یونان کے یقینی انقلاب جن کی قیادت ماسکو نواز کمیونسٹ (سٹالنسٹ) جماعتوں کے پاس تھی کو قربان کر دیا گیا۔ ان پالیسیوں کے نتیجے میں سامراج کو عالمی طور پر ایک نئے (تاریخ کے سب سے لمبے ابھار 73-1948) سرمایہ دارانہ عروج کا موقع مل گیا جس کو استعمال کرتے ہوئے خصوصاً امریکی سامراج نے اپنی پوزیشن عالمی اقتصادی اور سیاسی طور پر مستحکم کی۔ اس معاشی ابھار کے اثرات سے سوویت یونین پر بھی معاشی اور اقتصادی دباؤ بڑھنا شروع ہوگیا۔'' ایک ملک میں سوشلزم کی فرسودہ پالیسی کے تحت ابتدائی 3 دہائیوں میں سٹالنزم نے سوویت معیشت کو محدود کر کے رکھ دیا اور عالمی منڈی میں شراکت نہیں کی۔ صرف 1953ء میں سٹالن کی موت کے بعد معیشت کے اندرونی دباؤ کی بنیاد پر عالمی منڈی میں مداخلت کی گئی اور اس کو بھی بڑا محدود رکھا گیا۔ دوسری جانب سوویت یونین پر سامراج کا معاشی دباؤ بڑھ رہا تھا اور سامراجی ممالک میں انقلابی تحریکوں کے ماند پڑنے سے حالات بدتر ہو رہے تھے جس کو سٹالنسٹ لیڈر سمجھنے سے قاصر رہے۔ ٹراٹسکی نے سٹالنسٹ نظریہ دانوں کی اس سوچ کے بارے میں 1929ء میں لکھا تھا۔

''یہ (لیڈر) اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے کہ ایک فورڈ ٹریکٹر اتنا ہی خطرناک ہے جتنی کروساٹ (Crevesot) کی توپ ہے۔ ان میں واحد فرق یہ ہے کہ توپ کبھی کبھی استعمال ہوتی ہے جبکہ ٹریکٹر مسلسل دباؤ بڑھاتا رہتا ہے اس کے علاوہ ٹریکٹر یہ بھی جانتا ہے کہ آخری حربے کے طور پر توپ اسکے پیچھے رہتی ہے۔ (ٹراٹسکی 1929)

لینن نے بھی اس خطرے کی واضح نشاندہی کی تھی۔ ''جب تک ہماری سوویت ریپبلک علیحدہ سرحدوں میں محدود رہتی ہے جس کو ساری سرمایہ دارانہ دنیا نے گھیرا ہوا ہے۔ اس وقت تک یہ ایک بے وقوفانہ خواب اور بے ہودہ تصوراتی یوٹوپیا ہوگا۔ جب ہم یہ سوچنا شروع کر دیں کہ ہمیں مکمل

معاشی آزادی حاصل ہوچکی ہے اور ہمارے خطرات ختم ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری کو اگر اس کے عالمی پیمانے پر لیا جائے تو اب بھی نہ صرف فوجی بلکہ معاشی لحاظ سے وہ سوویت طاقت سے زیادہ طاقتور ہے۔ ہمیں اس بنیادی کیفیت کو مدنظر رکھ کر یہاں سے آگے بڑھنا ہوگا اور اس کو کبھی فراموش نہیں کرنا ہوگا۔

(لینن-تصانیف-جلدنمبر XVII صفحات 102 اور 409)

روس جو غربت کا دیس ہے وہ امارت اور فراوانی کا دیس صرف اسی صورت بن سکتا ہے جب ہم بدگمانی اور مصنوعی نعرہ بازی کو جھٹک دیں اپنے دانتوں کو دباتے ہوئے اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کر کے ہرنس ہر پٹھے اور ہر رگ کو تان کر یہ سمجھیں کہ ہم نجات صرف اس بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب کی شاہراہ سے ہی حاصل کر سکتے ہیں جس پر ہم قدم رکھ چکے ہیں۔

(لینن-تصانیف-جلد XV صفحہ نمبر 165)

لیکن لینن کے برعکس روس میں سٹالنزم کی سوچ رکھنے والی افسر شاہی نے نہ صرف سامراج کے حوالے سے بلکہ دوسرے ممالک میں جنم لینے والے ''سوشلسٹ'' انقلابات کے حوالے سے بھی حامل محنت کش تحریک کو زبردست نقصان پہنچایا۔ چین' کیوبا' ویتنام' کمبوڈیا' لاؤس' موزمبیق' انگولا اور دوسرے ممالک جہاں ریاستی بغاوتوں اور گوریلا جنگوں کے ذریعے انقلابات آئے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کو اکھاڑ پھینکا ان کے سامنے عالمی سیاست پر سوشلزم کا حاوی ماڈل ماسکو کا تھا۔ لیکن ان ادوار میں یہ ماڈل لینن کے ماسکو کے بجائے سٹالن' خروچیف' برزنیف اور ندروپوف کے ماسکو کا ماڈل تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے بھی وہی نظریات اور لائحہ عمل اپنایا جو ماسکو میں اقتدار پر براجمان سٹالنسٹ افسر شاہی کا تھا۔ اس طرح چین' سوویت یونین' کیوبا' ویتنام اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے الحاق سے جو ایک عظیم سوشلسٹ فیڈریشن بن سکتی تھی وہ ''ایک ملک میں سوشلزم'' کی پالیسی کے تحت قومی سوشلسٹ ریاستوں میں بٹ گئی۔ کامریڈ آپس میں اسلحہ' بارود اور میزائلوں کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ چینی' روسی اور دوسری افسر شاہیاں ''قومی مفادات'' کے تحت تمام پالیسیاں مرتب کر رہی تھیں۔ ان سے ''سوشلسٹ'' ممالک کے درمیان تضادات اور بعض اوقات جنگوں کی شکل میں تصادم ابھرے۔ یہ سٹالنزم کی قومی سوشلزم کی پالیسی کا منفی نتیجہ تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر افسر شاہی کی بدعنوانیوں کے بوجھ' مغرب کی نسبت ٹیکنیک میں پسماندگی' مزدور جمہوریت کے فقدان اور افسر شاہی کے جبر کی وجہ سے سوشلسٹ معیشت

کی رفتار سست ہونا شروع ہوگئی تھی ۔ 1950ء کی دہائی میں جب معیشت میں 12 سے 15 فیصد سالانہ کے اعتبار سے پیداوار میں اضافہ ہورہا تھا وہ 1960ء کی دہائی میں کم ہوکر 10 فیصد سے 12 فیصد ہوگیا اور 1970ء کی دہائی میں کم ہوکر 6 سے 8 فیصد ہوگیا اور 1980ء میں گورباچوف کے مشیر برائے اقتصادیات ابیل ابی بگیان کے مطابق 0% فیصد سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اس معاشی بحران نے افسرشاہی کے سیاسی اعتماد کو بھی سخت ٹھیس پہنچائی اور وہ تذبذب میں ڈوبنے لگی ۔ گورباچوف جو افسرشاہی کا نسبتاً ذہین اور چالاک نمائیندہ تھا۔ اس نے سٹالنزم میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن آمرانہ افسرشاہی کے جبر کے نیچے سلگتا ہوا معاشی سماجی اور قومی تضادات کا لاوا پرسٹریکا اور گلاسناسٹ کی پالیسیوں سے پھٹ پڑا۔ سٹالنزم کا بحران اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ اس میں اصلاحات کی گنجائش ختم ہوچکی تھی ۔ جب گورباچوف کو اپنی پالیسیوں کی شکست نظر آئی تو اس نے سامراج کی گود میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی ۔ اس کے خلاف گینا ڈی ژنائف کی قیادت میں پرانے سخت گیر سٹالنسٹوں کے ایک کمزور اور نحیف گروپ نے بغاوت کرنے کی کوشش کی جس کو سامراج کی پشت پناہی میں بورس یلسن نے ناکام کردیا۔ لیکن سامراجی حمایت میں روس میں سرمایہ داری کی دوبارہ استواری کی تکمیل ابھی تک مکمل نہیں ہوسکی ۔ 15 سال کی بے پناہ کوشش کے باوجود افسرشاہی کا سرمایہ دار مفاد پرست حصہ معیشت کو نجی ملکیت میں مکمل طور پر نہیں دے سکا۔ اس وقت بھی روس کی حاوی معیشت اور بھاری صنعت کا بیشتر حصہ آج بھی ریاستی ملکیت میں ہے ۔ جس کو پرائیویٹائز کرکے سرمایہ دارانہ منافع حاصل کرنے کے خواب چکنا چور ہوگئے ہیں ۔ جس سے ایک طرف سٹالنزم ٹوٹا ہے جبکہ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام شدید خلفشار کا شکار ہے اور اپنے قدم نہیں جما سکا۔ لیکن سابقہ سوویت یونین کی ریاستوں اور روس میں انسانی زندگی درندگی اور بربریت کی طرف جارہی ہے ۔ کسی بہتری کی بجائے تباہی اور بربادی کا دور دورہ ہے ۔ 1997ء تک روس میں بیروزگاروں کی تعداد 5 کروڑ تک ہوگئی تھی ۔ قیمتوں میں 700 سے 3600 فیصد اضافہ ہوا ۔ مکانوں اور کرایوں میں اضافے کی بھی یہی صورتحال تھی ۔ ماسکو میں جرائم کی رفتار اور تعداد میں 2000 فیصد اضافہ ہوگیا ہے ۔ روبل کی قیمت 1992ء میں تقریباً ایک ڈالر کے عوض 2 روبل کی تھی ۔ 1997ء میں ایک ڈالر کے عوض ہزاروں روبل تھی ۔ اس معاشی اور سماجی بدحالی نے روس کے محنت کشوں کو شدید صدمے اور اضطراب میں مبتلا کردیا ہے ۔ ایک طرف انہوں نے کئی نسلوں تک ''سوشلزم'' اور ''کمیونزم'' کے نام پر 60 سال تک سٹالنزم کا کھلواڑ برداشت کیا ۔ جس سے ان کو

شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی ۔لیکن سرمایہ داری کو استوار کرنے کے عمل نے تو ان کو تباہی و بربادی کی ایک بھیانک کھائی میں دھکیل دیا ہے ۔اسی وجہ سے روس میں خلفشار' سماجی بے چینی اور ہلچل اپنی انتہاؤں کو پہنچ گئی ہے ۔ یہ اضطراب نہ صرف سماج کی نچلی سطحوں میں بحران کو بڑھا رہا ہے بلکہ ریاست اور افسر شاہی کے مختلف حصوں میں تضادات اور تصادم بڑھ گیا ہے ۔یہی صورتحال فوج میں بھی پائی جاتی ہے ۔

سوویت یونین کا ٹوٹنا مارکسٹوں کیلئے کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کی پیشین گوئی اس کے بانیوں نے ہی کی تھی ۔

ٹراٹسکی نے 1920ء میں لکھا تھا'' ایک درست قیادت کے بغیر پرولتاریہ کی آمریت (مزدور جمہوریت) کمزور پڑ جائے گی اس کا ٹوٹ کر گر جانا بین الاقوامی انقلاب پر ایک سخت ضرب لگائے گا جس سے صحت یاب ہونے اور نکلنے میں بہت سے سال لگ جائیں گے۔'' مارکس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''سرمایہ'' میں واضح کیا تھا کہ ذرائع پیداوار جب کسی ایک معاشی اور قومی ڈھانچے میں جنم لیتے ہیں تو ان کے ارتقاء کے عمل کے راستے میں جب قومی حدود یا کسی تنگ نظر نظام کی دیواریں حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو ان ذرائع پیداوار کا ٹھہراؤ پھر اس سماج میں گھٹن اور خلفشار پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ سماج اور نظام تاریخی استبداد کا شکار ہو جاتا ہے اور اسکی ٹوٹ پھوٹ ناگزیر ہو جاتی ہے ۔سوویت یونین میں بھی یہی کچھ ہوا ہے ۔اسی لیے سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ مارکسزم کی نفی نہیں کرتی بلکہ ایک منفی انداز میں اسکی سائنسی سچائی کو ثابت کرتی ہے ۔اسی بنیاد پر یہ بات ایک سائنسی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج بھی اکتوبر کی سرزمین کی واحد راہ نجات ایک نیا اور جدید سوشلسٹ انقلاب ہی ہو سکتا ہے ۔

ترتیب وتحقیق: حنا زین

کمپوزنگ، پروف ریڈنگ: حنا زین

اپنی تجاویز اور آراء کے لئے ای میل کریں: hasan@marxists.org